وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ

اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے کہ سوچے، سمجھے

جلد 8	شمارہ 05	رجب 1435ھ	مئی 2014ء

ISSN 2305-6231

ماھنامہ

حکمتِ بالغہ

جھنگ

مدیر مسئول : انجینئر مختار فاروقی

مشاورت

ڈاکٹر محمد سعد صدیقی

حافظ مختار احمد گوندل

پروفیسر خلیل الرحمٰن

محمد فیاض عادل فاروقی

مدیر معاون ونگران طباعت: مفتی عطاء الرحمٰن

تزئین وگرافکس: سعد حسن خان

قانونی مشاورت:

محمد سلیم بٹ ایڈووکیٹ، چودھری خالد اختر ایڈووکیٹ

ترسیل زر بنام: انجمن خدام القرآن رجسٹرڈ جھنگ

اہل ثروت حضرات کے لیے تاحیات زرتعاون سترہ ہزار روپے یکمشت

سالانہ زرتعاون: اندورنِ ملک 400 روپے، قیمت فی شمارہ 40 روپے

قرآن اکیڈمی جھنگ

لالہ زار کالونی نمبر 2، ٹوبہ روڈ جھنگ صدر پاکستان پوسٹ کوڈ 35200

047-7630861-7630863

ای میل: hikmatbaalgha@yahoo.com

ویب سائٹ: www.hikmatbaalgha.com

www.hamditabligh.net

پبلشر: انجینئر مختار فاروقی طابع: محمد فیاض مطبع: سلطان باہو پریس فوارچوک جھنگ صدر

اَلْکَلِمَۃُ الْحِکْمَۃُ ضَآلَّۃُ الْمُؤْمِنِ فَحَیْثُ وَجَدَھَا فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا (ترمذی)

حکمت کی بات بندۂ مومن کی گم شدہ متاع ہے جہاں کہیں بھی وہ اس کو پائے وہی اس کا زیادہ حق دار ہے

مشمولات

1	قرآن مجید کے ساتھ چند لمحات	سورۃ النازعات	3
2	بارگاہِ نبوی ﷺ میں چند لمحات		5
3	حرفِ آرزو	انجینئر مختار فاروقی	6
4	درسِ قرآن مجید کی تیاری کیسے کریں؟3		9
5	رسولِ اکرم ﷺ کے احسانات (حصہ اوّل)	انجینئر مختار فاروقی	21
6	اجتہاد، اختلافِ محمود اور تفرّد	حافظ مختار احمد گوندل	29
7	یورپ پر اسلام کے احسانات (سلسلہ وار)	انجینئر مختار فاروقی	42
8	مدیر کے نام		56
9	مکتبہ کی مطبوعات		61

ماہنامہ حکمت بالغہ میں قلمی تعاون کرنے والے حضرات کے مضامین معلومات کے تبادلے اور وسیع تر انداز میں خیر کے حصول اور شر سے اجتناب کے لیے چھاپے جاتے ہیں ادارے کا مضمون نگار حضرات سے تمام جزئیات میں اتفاق ضروری نہیں۔

یہ رسالہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو حوالہ ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ نہ ملنے کی صورت میں 6 تاریخ تک دفتر رابطہ فرمائیں (ادارہ)

قرآن مجید

کے ساتھ

چند لمحات

سورۃ النازعات 79 ﴿آیات 34-46﴾

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فَاِذَا جَآءَ تِ الطَّآمَّۃُ الْکُبْرٰی O

توجب بڑی آفت آئے گی

یَوْمَ یَتَذَکَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰی O

اس دن انسان اپنے کاموں کو یاد کرے گا

وَ بُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِمَنْ یَّرٰی O

اور دوزخ دیکھنے والے کے سامنے کردی جائے گی

فَاَمَّا مَنْ طَغٰی O

توجس نے سرکشی کی

وَ اٰثَرَالْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا O

اور دنیا کی زندگی کو مقدم سمجھا

فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰی O

اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے

وَ اَمَّا مَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ

اور جو اپنے پروردگا کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا

وَ نَهَى النَّفۡسَ عَنِ الۡهَوٰى O

اور جی کو خواہشوں سے روکتا رہا

فَاِنَّ الۡجَنَّةَ هِىَ الۡمَاۡوٰى O

اس کا ٹھکانہ بہشت ہے

يَسۡئَلُوۡنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرۡسٰهَا O

(اے پیغمبر ﷺ) لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں

کہ اس کا وقوع کب ہوگا؟

فِيۡمَ اَنۡتَ مِنۡ ذِكۡرٰهَا O

سو آپ ﷺ اس کے ذکر سے کس فکر میں ہو؟

اِلٰى رَبِّكَ مُنۡتَهٰهَا O

اس کا منتہا (یعنی واقع ہونے کا وقت) تمہارے پروردگار ہی کو (معلوم) ہے

اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرُ مَنۡ يَّخۡشٰهَا O

آپ ﷺ اسی کو ڈر سنانے والے ہو جو شخص اس سے ڈر رکھتا ہے

كَاَنَّهُمۡ يَوۡمَ يَرَوۡنَهَا لَمۡ يَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا عَشِيَّةً اَوۡ ضُحٰهَا O

جب وہ اس دن کو دیکھیں گے (تو خیال کریں گے)

کہ گویا وہ صرف ایک شام یا صبح ہی یہاں ٹھہرے تھے

صَدَقَ اللّٰهُ الۡعَظِيۡم

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند

بتانِ وہم و گماں ، لا اِلٰہ اِلا اللہ

بارگاہِ نبوی ﷺ میں چند لمحات

قَالَ النَّبِیُّ ﷺ

اِجْتَمِعُوْا عَلٰی طَعَامِکُمْ، وَ اذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْہِ یُبَارَکْ لَکُمْ فِیہِ

کھانے کے وقت جمع ہوجایا کرو اور اس پر اللہ کا نام لیا کرو، تمہارے لیے اس میں برکت دی جائے گی

(ابوداؤد، عن وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ)

اِجْتَنِبُوا الْکَبَائِرَ، وَسَدِّدُوا، وَأَبْشِرُوْا

کبیرہ گناہوں سے دور رہو اور راہِ راست پر چلتے رہو اور خوشخبری حاصل کرو (مسند احمد، عن جابر رضی اللہ عنہ)

اِجْتَنِبُوْا کُلَّ مُسْکِرٍ

ہر نشہ آور چیز سے بچو (طبرانی، عن عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ)

الجَامِعُ الصَّغِیْر فی احادیث البشیروالنذیر، للامام جلال الدین السیوطی رحمہ اللّٰہ

پاکستان کی نظریاتی شناخت کا تحفظ
ایک نظریاتی نظامِ تعلیم سے ہی ممکن ہے؟

انجینئر مختار فاروقی

پاکستان اقوامِ عالم میں ایک منفرد قوم ہے جس کی شناخت اسلام ہے اور اسلام کے نام پر ہی 14/اگست 1947ء کو وجود میں آیا تھا۔ اس کے پس منظر میں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے عظیم ماضی کے نظریاتی ورثہ کے تحفظ کا وہ لازوال جذبہ تھا جس نے دوقومی نظریہ کی شکل اختیار کی تھی۔ یہ جذبہ اس وقت اسلام کی صحیح ترین تشریح اور روحِ عصر کا آسمانی ہدایت سے حسین امتزاج تھا۔

گزشتہ چند صدیوں کے مغربی استعمار کے ظالمانہ اور سفاکانہ غلبہ سے بہت سے کمزور ممالک کی قوت مزاحمت جواب دے گئی ہے اور وہ مغرب کی ہاں میں ہاں ملائے کھڑے ہیں۔ کچھ ممالک ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو ایک پالیسی کے طور پر وقتی طور پر مزاحمت سے بچنے کے لئے مغرب کا ساتھ دے رہے ہیں۔ جیسے NATO کے بعض ممالک NATO کے صہیونی ایجنڈا کا ساتھ دیتے ہوئے بھی اس کے مکمل ایجنڈے سے کچھ اختلاف رکھتے ہیں۔

تاہم عشرہ دو عشرہ پہلے مغرب سے شائع شدہ کتاب 'تہذیبوں کا تصادم' میں دیے گئے پروگرام کے مطابق مغرب نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بڑی دیدہ ریزی سے تیار کردہ ایک شیطانی منصوبہ شروع کر رکھا ہے۔ جسے وہ 'نیو ورلڈ آرڈر' کا نام دیتے ہیں حالانکہ وہ جیو (JEW) ورلڈ آرڈر ہے۔ یہ جنگ یہودی طبقہ نے عیسائی دنیا کو ساتھ ملا کر صلیبی جنگ کے طور پر شروع کی ہے اور اس کا ہدف مسلمان عوام، مسلمانوں کے عقائد، مسلمانوں کی آسمانی کتاب قرآنِ مجید، مسلمانوں کے

پیغمبر حضرت سیّدنا محمد ﷺ، مسلمانوں کے مقدس مقامات، شعائر اسلام اور مسلم تہذیب و کلچر کے نشانات کو ختم کر دینا بھی ہے۔ اس صلیبی جنگ کا سب سے بڑا ہدف جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے اسلام کے غلبے کے خوابوں کی دنیا اور بانیان پاکستان کے افکار کا مظہر پاکستان ہی ہے۔ یہ صلیبی جنگ پاکستان میں مغرب کے نمائندہ کے طور پر بے لگام میڈیا نے سنبھال رکھی ہے اور مغرب کے پروردہ NGO'S کے ذریعے بے دریغ سرمایہ کے زور پر یہ جنگ جاری ہے۔ اس جنگ کا ایک شعبہ، ملک کی نظریاتی سرحدوں کو کمزور کرنا بھی ہے۔ یہ نصب العین مغرب کے ساتھ ساتھ ہمارے روایتی حریف اور پڑوسی ملک بھارت کے دل کی آرزو بھی ہے۔ اس نظریاتی آویزش اور جنگ میں عام مسلمان اور دردمند مسلمانانِ پاکستان اور ابنائے وطن کو کیا کرنا چاہئے یہ گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے۔ ان سطور میں صرف اس بات کی اہمیت واضح کرنا مقصود ہے کہ آج کی ریاستیں بعض ٹھوس بنیادوں پر قائم ہیں۔ جو اس ملک کے عوام کی اکثریت کے نظریات کے مطابق تشکیل پاتی ہیں۔ ہمارے ملک پاکستان کے لئے، جو کہ اسلامی نظریہ کا حامل ملک ہے درج بنیادیں بہت اہم ہیں۔

- ایک آئین ـــ جو مسلمانانِ پاکستان کے درمیان حکومتوں کے بناؤ اور بگاڑ کے معاملات کے ساتھ باہمی اختلافات کو طے کرنے اور ملک کو مستحکم کرنے کے متفقہ اُصول و ضوابط پر مشتمل ہو۔
- ایک مقنّنہ ـــــ جو ایسے باعمل مسلمان افراد پر مشتمل ہو جن کی اسلام سے نظریاتی وابستگی ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہو۔ جن کا ظاہر اور پبلک لائف اسلام کے نظریہ کی عکاس ہو۔ (جیسے آئین کی دفعات 63,62 پر پورا اُترنا)
- ایک عدلیہ جو قرآن و سنت سے واقف ہو اور نظریہ پاکستان سے اٹل وابستگی کی حامل ہو ـــــ مقنّنہ کی طرح بنیادی اسلامی شرائط کی پابند ہو اور حکومتی دباؤ سے آزاد بھی ہو اور 'آزاد خیالی' سے کوسوں دُور۔
- ایک انتظامیہ ـــــ جس کے افراد صدر، وزیراعظم سے لیکر قاصد اور نائب قاصد تک تمام افراد ممبرانِ پارلیمنٹ کی سی بنیادی شرائط پر پورے اُترتے ہوں اور اسلام سے ان کی وابستگی یعنی COMMITMENT زندگی اور موت کے مسئلہ کی طرح ناگزیر ہو۔
- ایک ایسی فوج ـــــ جس کے اعلیٰ عہدوں سے لیکر ایک عام سپاہی تک ـــــ تمام افراد ممبرانِ پارلیمنٹ کی طرح بنیادی اسلامی نظریاتی شرائط کے حامل ہوں ان کی اسلام اور ملک

پاکستان سے نظریاتی وابستگی رگ رگ میں رچی بسی ہو ان کی وردی سے لے کر پیشہ وارانہ مصروفیات تک سب اسلام اور نظریۂ پاکستان کے تابع ہوں تاکہ اسلام اور ملک پاکستان کا اسلامی اُصولوں کے مطابق دفاع کرسکیں۔

■ ایک ایسا نظامِ تعلیم ـــــ جو دوقومی نظریہ اور اسلامی تعلیمات کا مُلخّص (ESSENCE) ہو جو نونہالانِ وطن کو نظریہ پاکستان سے وابستہ کرسکے اور گہری پختگی پیدا کرے یاد رہے کہ نظریاتی تعلیم ـــــ ہی وہ واحد ذریعہ (TOOL) ہے جس کے ذریعے کسی نظریاتی ملک کی نئی نسل کو ملک کا بنیادی فلسفہ ونظریہ وروایات کی تعلیم پچھلی نسل سے نئی نسل کو منتقل ہوتی ہے اور ہمارے نزدیک پاکستان جیسے نظریاتی ملک کے لئے ایک نظریاتی نظامِ تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔

اس نظریاتی نظامِ تعلیم سے ہی ممکن ہے کہ کل کو ہماری نئی نسل جو مقنّنہ (پارلیمنٹ)، عدلیہ، انتظامیہ، اور فوج کا حصہ بنے گی وہ ہر شعبہ میں ملک کے نظریاتی تحفظ کے ضامن بنیں۔

■ ایک (مادر پدر آزاد نہیں) حکومتی دباؤ سے آزاد نظریاتی میڈیا کی جس کے تمام افراد بھی اسلامی نظریاتی حدود سے کماحقہٗ واقف ہوں اور ارکانِ پارلیمنٹ کی طرح اسلامی تعلیمات کے کم سے کم معیارات پر پورے اُترتے ہوں۔

یہ بات کتنی مضحکہ خیز ہوگی کہ الیکشن کے موقع پر ریٹرننگ آفیسر خود آئین کی دفعات 63,62 پر پورا نہ اُترے اور دوسروں کو چیک کر رہا ہو۔ میڈیا کے ارکان اور ذمہ داران خود کسی اسلامی اُصول کا مذاق اُڑائیں اور دوسروں سے نظریاتی حدود کی توقع رکھیں۔ کوئی طالع آزما ڈکٹیٹر حکومت پر قبضہ کرلے جبکہ اس کو نااہل قرار دینے کے لئے آئین کی دفعات 62 ,63 ہی کافی ہوں۔ اسی پر اور مثالیں بھی قیاس کی جاسکتی ہیں۔

اس تحریر کے ذریعے ہمارے ہر دردمند مسلمان سے التماس ہے کہ چونکہ پاکستان میں 97% مسلمان ہیں لہٰذا بلا لحاظ مسلک ومشرب ہمیں غور کرنا چاہئے کہ آج ہمارے مقنّنہ، عدلیہ، انتظامیہ، فوج اور نظامِ تعلیم ـــــ نظریہ پاکستان کے حوالے سے کہاں کھڑے ہیں۔ ہمارے نزدیک جو شخص بھی غور کرے گا اسے اس ضمن میں خوفناک اور مہیب 'خلا' نظر آئیں گے۔

اگر ایسا ہے ـــــ تو پھر سر جوڑ کر بیٹھنے، سوچنے ـــــ لائحہ عمل تیار کرنے اور عمل کے لئے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے ـــــ اس سے پہلے کہ حالات ناقابل اصلاح حد تک خراب ہوجائیں آیئے ہر شخص اس ضمن میں اپنے حصہ کے کام کرنے کا عہد کرے۔ آمین ـــــــ

درسِ قرآن کی تیاری کیسے کریں

انجینئر مختار فاروقی

3

درسِ قرآن کی تیاری کے لئے تیسری چیز جس کا خیال رکھنا چاہئے وہ تخلیق انسانی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت شدہ (IN-BUILT) بعض خوبیاں اور صلاحیتیں ہیں۔ یہ انسانی خوبیاں انسان کو حیوان سے جدا کرنے والی امتیازی خوبیاں ہے جن کا تذکرہ کر کے انسان کو انسان ہونے کا احساس دلانا بہت ضروری ہے۔

دو انسان اگر کسی مسئلے پر اُلجھ پڑیں اور بات اخلاق سے نکل کر بدتمیزی اور ہاتھا پائی پر آجائے تو ہر معقول انسان یہی تلقین کرتا ہے کہ بھائی انسان بنو وحشی نہ بنو۔ گویا عوام کے نزدیک بھی انسان اور حیوان کے مابین ایک حد فاصل ہے، جس سے گزر کر انسان حیوان بن جاتا ہے۔ قرآن و حدیث کے مطالعہ سے انسان کے اندر ودیعت شدہ جن خوبیوں کا تذکرہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہیں:

☆ ہر معقول اور مہذب انسان کے ضمیر میں (دل میں) اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے ایک خالق و مالک اور ربّ کا تصور ڈالا ہے اور اپنی محبت کا ایک حصہ بھی ودیعت فرمایا ہے۔

☆ ہر معقول اور مہذب انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک باطنی حس رکھی ہے جو انسان کو خیر اور شر یا نیکی اور بدی میں تمیز کر کے بتاتی رہتی ہے۔ آپ کوئی عمل کریں ـــــ آپ کا ضمیر یا

آپ کے اندر کا انسان فوراً آپ کو احساس دلائے گا کہ یہ کام صحیح ہوا ہے یا غلط اور غلط کام کی شدت کے مطابق اس پر احساس گناہ بھی رہتا ہے۔ اس ضمیر کو انگریزی میں CONSCIENCE کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے:

وَ نَفۡسٍ وَّ مَا سَوّٰهَا O فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰهَاO قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰهَاO وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰهَا O (90 - 07 تا 10)

''اور (قسم ہے) انسان کی اور اس کی جس نے اس کے اعضا کو برابر کیا، پھر اس کو بدکاری اور پرہیزگاری کی سمجھ دی۔ جس نے اپنے نفس (یعنی روح) کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا۔''

سورۃ القیامہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

بَلِ الۡاِنۡسَانُ عَلٰی نَفۡسِهٖ بَصِيۡرَةٌ O وَّلَوۡ اَلۡقٰی مَعَاذِيۡرَهٗ O (10-11:75)

''بلکہ انسان آپ اپنا گواہ ہے اگرچہ عذر و معذرت کرتا رہے''

اسی ضمیر یا CONSCIENCE کے بارے میں ہر ملک اور ہر علاقے اور ہر زبان میں الفاظ موجود ہیں۔ گذشتہ صدی کے وسط تک مغربی تہذیب میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو ضمیر کے بارے میں بالکل صحیح نقطہ نظر رکھتے تھے اگرچہ اس کے بعد مغربی تہذیب کے پیچھے کارفرما ہاتھوں نے بالارادہ ایسی تعلیم کو رواج دیا ہے کہ MORALLESS اور VALUELESS سوسائٹی وجود میں آ گئی ہے اور اسی جدید سوسائٹی کا نام مغرب نے سول سوسائٹی (CIVIL SOCIETY) یا اس کا نام 'آزادی' رکھا ہے یہ 'آزادی' کا لفظ سیاسی آزادی نہیں ہے جو لفظ ہم 14/اگست 1947ء کے حوالے سے قیامِ پاکستان کے لئے بولتے ہیں بلکہ یہ 'آزادی' ـــــ ہر ضابطے، اُصول اور پابندی (چاہے وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے ہی کیوں نہ) ہو، ہر مذہبی حکم اور ہر سماجی بندھن سے آزادی اور بغاوت کا نام ہے اور اسی آزادی کو لبرل ازم (LIBRALISM) کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے سوچ کی یہ ساری تبدیلی مغربی معاشرہ کے حیوانی سطح تک گر جانے کا مظہر ہے۔

ذیل میں ہم چند مشہور مغربی مفکرین اور غیر مسلم دنیا کے زعماء کے اقوال نقل کر رہے

ہیں جس سے یہ ثابت ہوگا کہ انسان کے اندر ایک ضمیر کی موجودگی ـــــــ ایک بین الاقوامی اور عالمی حقیقت ہے۔

1 امریکی تاریخ دان جارج بنکرافٹ (GEORGE BANCROFTS) لکھتا ہے:

CONSCIENCE IS THE MIRROR OF OUR SOULS, WHICH REPRESENTS THE ERROR'S OF OUR LIVES IN THEIR FULL SHAPE.

انسان کا ضمیر اس کی روح کا آئینہ دار ہوتا ہے جو کہ اس کی زندگی کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو اس کی اصلی شکل میں اس پر ظاہر کرتا ہے۔

2 نامعلوم مغربی مفکر کا قول ہے:

LEARN TO KEEP ALIVE IN YOUR HEART THAT LITTLE SPARK OF CELESTIAL FIRE 'CONSCIENCE'.

اپنے دل میں ضمیر کے اس ننھے سے شعلے کو زندہ رکھنے کا سلیقہ سیکھو، ضمیر کا یہ شعلہ خالق کائنات کے 'نور' کا پرتو ہے۔

3 امریکن سیاسی شخصیت رابرٹ گرین انگرسول (1838-1899) کہتا ہے:

COURGE WITHOUT CONSCIENCE IS A WILD BEAST.

انسانی ہمت، ضمیر کے بغیر ایک جنگلی درندہ (کی مانند) ہے۔

4 جوزف ایڈیسن برطانوی نثر نگار (1672-1719) کہتا ہے:

A GOOD CONSCIENCE TO THE SOUL IS WHAT HEALTH IS TO THE BODY AND IT PERSERVES CONSTANT EASA AND SERENITY WITAIN US. AND MORE THAN COUNTER VAILS ALL THE CALAMITIES AND AFFLICTIONS WHICH CAN BEFALL US FROM WITHOUT.

''ایک زندہ ضمیر کا روح (انسانی) سے وہی رشتہ ہے جو صحت کا ہمارے جسم سے ہے۔ اور یہ ضمیر ہمیں اندرونی طور پر ہمہ وقت آسانی اور حکمت فراہم کرتا ہے۔ اور

مزید برآں ـــــ انسان پر خارجی طور پر وارد ہونے والی ساری مصیبتیں اور پریشانیوں کی پہچان اوران سے بچاؤ کا طریقہ بتاتا ہے۔''

5 چینی کہاوت ہے:

HE WHO SACRIFICES HIS CONSCIENCE TO AMBITION BURNS A PICTURE TO OBTAIN THE ASHES.

''ہر وہ شخص جو (دنیاوی) خواہشات کے عوض ضمیر قربان کر دیتا ہے وہ ایسے ہی ہے جو راکھ حاصل کرنے کے لئے ایک (نادر) تصویر جلا دیتا ہے۔''

6 عمانویل سویڈن برگ کہتا ہے:

"CONSCIENCE IS GOD'S PRESENCE IN MAN."

''انسان کے اندر ضمیر کی بیداری اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی (ایک تجلی کی موجودگی) کا مظہر ہے۔''

7 فرانسیسی کہاوت ہے

THERE IS NO PILLOW SO SOFT AS A CLEAR CONSCIENCE.

''انسان کے لئے صاف اور مطمئن ضمیر سے بڑھ کر کوئی نرم تکیہ نہیں ہے (کہ انسان آرام سے سو سکے)''

8 THE ONE THING THAT DOESN'T ABIDE BY MAJORITY RULE IS A PERSON'S CONSCIENCE (ATTICUS FINCH TO KILL A MOCKINGBIRD)

انسان کے ضمیر کا فیصلہ اکثریت کی رائے کا پابند نہیں ہے۔

9 چینی کہاوت ہے:

A CLEAR CONSCIENCE IS THE GREATEST ARMOR.

''انسان کا زندہ ضمیر اس کو راہِ راست پر رکھنے کے لئے سب سے بڑا ہتھیار ہے۔''

10 CONSCIENCE IS A MAN'S COMPASS. (VINCENT VAN GOGH)

''انسان کا ضمیر اچھے اعمال کی طرف رہنمائی کے لئے قطب نما کا کام دیتا ہے۔''

(IZQUOTES.COM,PICSMEME.COM,FAMOUSQUOTES ABOOT.COM)

ضمیر کی یہ آواز ہر معقول انسان میں ودیعت کی جاتی ہے اور یہ آواز مسلسل اور ہمہ وقت انسان کو اس کے اعمال پر غلطی کا احساس دلاتی رہتی ہے۔

درس قرآن مجید میں اگر متعلقہ آیاتِ درس میں ایسا مضمون ہو تو یہ بات تفصیل سے بیان کرنا ضروری ہے اور اگر آیات کا مفہوم نہ بھی ہو تو بھی گاہے بگاہے اس بات کا اظہار اور بیان ضروری ہے اور یہی چیز ہر سننے والے کو اپنے گریبان میں جھانکنے پر آمادہ کرتی ہے اور احساس زیاں دلاتی ہے ضمیر کی خلاف ورزی پر انسان کے اندر گناہ کا احساس ہونا اور GUILTY FEEL کرنا ہر شخص کا ذاتی تجربہ ہے لہٰذا یہ تفصیل بیان کر کے سامعین اور شرکاء کو اصلاحِ احوال اور توبہ پر آمادہ کرنا ضروری ہے۔ یہ ضمیر کی آواز ایک آفاقی حقیقت ہے اور ہر انسان اس سے واقف ہے اور یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جو آج مغرب کے لوگوں کو توبہ کی طرف آمادہ کر رہی ہے اور قرآن مجید کے مطالعہ اور اسلام کے قریب لا رہی ہے۔

اس ضمیر کی آواز کے بارے میں کچھ تفصیلی معلومات ہیں وہ بھی مختصراً ذہن نشین رہیں اور وقتاً فوقتاً تذکرے میں آتی رہیں تو سامعین کے ساتھ ساتھ مدرس کی اپنی اصلاح کا سامان بھی ہوتا رہے گا۔

☆ ضمیر انسانی جب بیدار ہوتا ہے اور زندہ ہوتا ہے تو اس میں 'حق کی پہچان' اللہ تعالیٰ کی پہچان اور نیکی بدی کی تمیز بہت تیز (SHARP) ہوتی ہے۔ انسان کی ابتدائی عمر ہی سے نیکی بدی کا احساس ہونے لگتا ہے چھوٹے بچوں میں بھی کھیل کود میں باری نہ ملے تو 'ناحق' اور 'بے ایمانی' کے الفاظ سننے میں آتے ہیں اسی طرح 'ستر' اور لباس کا احساس بھی ابتدائی عمر میں ہی ہو جاتا ہے۔ ستر کا احساس فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے اور عام انسانی معاشروں میں بھی کسی بچے کے سر یا گردن پر ہاتھ رکھیں تو شفقت شمار ہوتی ہے کندھوں پر تھپتھپائیں تو ہمدردی اور حوصلہ افزائی کا اظہار ہوتا ہے مگر ایک غیر مرئی لکیر ہے جس سے ذرا نیچے کمر پر ہاتھ رکھنا 'شیطانی عمل' شمار ہوتا ہے اور ہر مہذب معاشرے میں بے حیائی سمجھا جاتا ہے یہی 'ستر' اور لباس کے احساس کی بنیاد ہے عین جوانی میں

(اگر انسان خراب ماحول میں نہ پڑ جائے تو) یہ احساس نہایت واضح اور بار بار ہوتا ہے اور مسلسل انسان کا پیچھا کرتا ہے اور انسان کے اپنے خالق مالک کے سامنے 'جوابدہ' اور ذمہ دار مخلوق ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ قرآن مجید میں اسے 'نفس لوامہ' کہا گیا ہے۔

☆ اس ضمیر کی آواز پر اگر کان دھریں اور اس کے مطابق مجموعی طور پر زندگی گزاریں تو یہ 'آواز' اور 'احساس' زندہ اور بیدار رہتا ہے اور انسان کو ایک اندرونی رہنمائی ملتی رہتی ہے۔ قرآن پاک میں اس احساس کو قیامت کے دن کے حساب اور مواخذے کے لئے بنیاد کہا گیا ہے۔

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ O وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ O اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ O بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ O (75-1 تا 4)

''ہم کو روزِ قیامت کی قسم اور نفس لوامہ کی (کہ سب لوگ اٹھا کر کھڑے کیے جائیں گے) کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی (بکھری ہوئی) ہڈیاں اکٹھی نہیں کریں گے؟۔ ضرور کریں گے (اور) ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اس کی پور پور درست کر دیں گے۔''

☆ اس ضمیر اور اندرونی آواز کے بارے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ اگر اس ضمیر کی آواز پر مسلسل توجہ نہ دی جائے اور اس کے مطابق عمل نہ کیا جائے تو یہ آواز کمزور ہو جاتی ہے اور نظری طور پر ایک مرحلہ ایسا بھی آسکتا ہے کہ یہ آواز ختم ہو جائے جیسے کسی موبائل کی بیٹری کمزور ہو جائے تو سگنل اور آواز آنا بند ہو جاتی ہے۔

☆ ضمیر کی آواز ختم ہو جائے تو ہم اپنے معاشرے میں اسے 'بے ضمیر' اور 'مردہ ضمیر' شخص کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ قرآن پاک میں اس کیفیت کے لئے 'دلوں پر مہر کر دینا' کے الفاظ آئے ہیں اور پھر ایسے شخص کے لئے کوئی وعظ، درس، نصیحت کارگر نہیں ہوتی۔

☆ یہ بھی نہایت اہم ہے کہ ہم عام انسان جلدی میں دوسرے کو مردہ ضمیر یا بے ضمیر کہہ دیتے ہیں چاہے انسان صرف ایمان کی کمزوری کی بنا پر عمل کی کوتاہی کرے۔ انسانوں کی اکثریت ضمیر کی کمزوری کے درجے میں ہے کوئی کم کوئی ذرا زیادہ۔ ضمیر کا بالکل مردہ ہو جانا اس مرحلے کی آخری سٹیج ہے اور انسان اپنی اصلاح نہ کرے تو وہ مرحلہ بھی آ ہی جاتا ہے۔

☆ یہ بات اللہ نے اپنے پاس رکھی ہے کہ یہ فیصلہ سنایا جائے کہ کس کا ضمیر ابھی زندہ ہے اور کس کا واقعی ضمیر مردہ ہو چکا ہے۔ضمیر چھپی ہوئی چیز کا نام ہے اور دل کی بات کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے۔لہٰذا ـــــ کسی دوسرے شخص کے بارے میں ایک دو مرتبہ تنبیہ کے بعد انسان زبان سے 'مردہ ضمیر' یا بے ضمیر کہہ دے یہ بڑی بچگانہ اور عجلت پسندی کی بات ہے بلکہ ہمارے لئے تو صرف ظاہر کا معاملہ ہے کہ ہم ہر مسلمان (اور غیر مسلم کو بھی اسلام کی دعوت دیں گے) نیکی بھلائی اور قرآن مجید کی طرف دعوت دیتے رہیں گے بھلے وہ ہماری بات نہ سنے اور توجہ نہ کرے یہی سنت عمل ہے۔ہمارے آقا جناب محمد ﷺ بھی یہی طرزِ عمل اختیار فرماتے تھے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے خود 13 سالہ مکی زندگی کے بعد مدینہ ہجرت کے دوسرے سال سورۃ البقرہ کے پہلے رکوع میں چند لوگوں کی عمومی بات فرمائی (نام نہیں لئے) کہ ایسے لوگوں کے دلوں پر 'مہر' ہو چکی ہے یہ لوگ اب ایمان نہیں لائیں گے۔تاکہ یہ بات واضح رہے کہ 'ختم قلوب' کی صورت بھی ایک ممکنہ صورت ہے اور انسان کو اس سے ڈرنا چاہئے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ O خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ وَعَلٰی سَمۡعِہِمۡ وَعَلٰۤی اَبۡصَارِہِمۡ غِشَاوَۃٌ وَّلَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ (06-07:02)

''جو لوگ کافر ہیں انہیں تم نصیحت کرو یا نہ کرو ان کے لیے برابر ہے وہ ایمان نہیں لانے کے۔اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا رکھی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ (پڑا ہوا) ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب (تیار) ہے۔''

☆ انسانوں کی اکثریت نفس 'لوامہ' کی کیفیت کے ساتھ ہی وقت گزار رہی ہے۔نیکی بدی کی پہچان ہر انسان کا مسئلہ ہے اور اس سوال کا فوری جواب ہر انسان کو اپنے اندر ہی مل جاتا ہے تفصیلی احکام تو انسان اہل علم سے ہی معلوم کرے گا۔ایک حدیث پاک میں آپ ﷺ نے ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا:

مَا الْبِرُّ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ	قَالَ: اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُق
نیکی کیا ہے؟ یا رسول اللہ ﷺ	فرمایا: نیکی حسن اخلاق ہے

مَا الْاِثْمُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ

گناہ کیا ہے؟ یارسول اللہ ﷺ

قَالَ: اَلْاِثْمُ مَاحَاكَ فِیْ نَفْسِكَ وَكَرِهْتَ اَنْ یَّطَّلِعَ عَلَیْهِ النَّاسُ (مسلم)

فرمایا: گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے اور تو ناپسند کرے کہ لوگ اس پر مطلع ہوں

ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا:

اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ .....وَ لَوْ اَفْتَاكَ النَّاس (مسند احمد)

''اپنے دل سے فتویٰ پوچھ لے.....اگرچہ لوگ تجھے فتویٰ دے دے''

مفتی صاحب کو آپ جو تفصیل بتائیں گے اس پر 'فتویٰ' مل جائے گا اگر کوئی بات نیک نیتی سے بھی بیان کرنے سے رہ گئی تو اس سے مفتی کا فتویٰ آپ کے حق میں صحیح نہیں ہوگا اسی لئے فرمایا ـــــ چاہے مفتی فتویٰ دے دے اپنے دل (ضمیر) سے بھی پوچھ لیا کرو۔

☆ اس ضمیر کے بالکل مردہ ہو جانے کی صورت میں تو دوبارہ اس کا زندہ ہونا یا فعال ہونا ناممکن ہے قرآن پاک میں یہی ارشاد ہے 'ختم قلوب' 'طبع قلوب' کے یہی معنیٰ ہیں۔ البتہ اگر ضمیر ابھی مرا نہیں صرف کمزور ہوا ہے تو اس ضمیر کو 'مجاہدات' اور مسلسل کوششوں سے دوبارہ زندہ اور فعال بنایا جاسکتا ہے۔ مخلص راہ بتانے والے مرشدین کے پاس انسان جا کر جو 'مجاہداتِ نفس' کا سبق لیتا ہے وہ اسی قبیل کی شے ہے۔ یہ کام کوئی ہمت ور خود بھی کرسکتا ہے اور کسی کو 'مرشد' سمجھ کر اس سے بھی رہنمائی لی جاسکتی ہے۔ اصلاح کی بیعت کا رواج اسی بنا پر ہوا اور اہل علم کے ہاں اسی لئے بیعت اصلاح 'مستحب' ہے جبکہ زندگی میں ہر مسلمان کے لئے دین پر عمل کے لئے اور اس دین کے پھیلانے اور عام کرنے پر غالب کرنے کے لئے جدوجہد اور جہاد (جو جنگ بھی ہوسکتا ہے) کی بیعت واجب کے درجے میں ہے۔

☆ لہٰذا اس اندرونی آواز کو جو بہت قیمتی ہے اور ایک دفعہ ختم ہو جائے تو دوبارہ کہیں سے نہیں مل سکتی اللہ تعالیٰ کا ایک تحفہ اور غنیمت سمجھتے ہوگے اس کی قدر کرنی چاہئے اور اس کو زندہ رکھنا چاہئے اسی کو ہمارے دینی لٹریچر میں 'زندہ دل' اور قلب جاری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

☆ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس اندرونی آواز اور ضمیر کی زندگی ـــــ ایمان والی زندگی ہے

اور ضمیر واقعی مردہ ہو جائے تو ایمان پیدا ہونے کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔ درسِ قرآن کی تیاری میں ان نکات کو ذہن میں رکھیں اور شرکائے درس کو آیات کے حوالے سے گاہے بگاہے اپنے ضمیر کی آواز اور اندرونی احساسات کا حوالہ دے کر عمل پر ابھارنے کی کوشش کریں تاکہ سننے والی پر اصلاح کی کوشش کے لئے زور ڈالنے کا عمل ایسا محسوس نہ ہو کہ یہ کوئی باہر سے خارجی دباؤ ڈالا جا رہا ہے بلکہ ضمیر کے حوالہ سے بات کریں گے تو ہر سننے والا اس کو اپنے دل کی آواز اور اپنا مسئلہ سمجھ کر توجہ کرے گا اور غور و فکر کرے گا جس سے ان شاء اللہ اصلاحِ احوال کی صورتیں پیدا ہوں گی اور مدرس کو بھی ایسی گفتگو کے دوران اپنے اندر جھانکنے کا موقع میسر آئے گا اور اس پر بھی توجہ رہے گی۔

4

درسِ قرآن کی تیاری کے لئے چوتھی بات یہ ہے کہ ہمارا ایمان ہے کہ قرآنِ مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور ہماری ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتے کے ذریعے حضرت محمد ﷺ پر اُتارا اور اُنہوں نے انسانوں تک پہنچایا یہ قرآن تمام انسانوں کے لئے ہدایت اور رہنمائی ہے۔

آپ ﷺ اپنے زمانے میں بھی پوری دنیا کے لئے نبی اور رسول تھے اور آپ ﷺ کا زمانہ نبوت و رسالت آج بھی جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا اس لئے کہ آپ ﷺ نے ختم نبوت کا اعلان فرما دیا۔

قرآن مجید انسانوں کے لئے ہدایت ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر انسان اس ہدایت پر توجہ نہیں کرتے اور نہ ہی آپ ﷺ کے دورِ مبارک میں دنیا کی اکثریت مسلمان ہوئی نہ خلافت راشدہ میں غور طلب بات یہ ہے کہ قرآن مجید کا مخاطب انسان کون ہے؟

قرآن مجید کے نزدیک انسانی حقیقی کی ایک خاص پہچان ہے، دو آنکھیں، دو کان، منہ، سر، دو ہاتھ اور دو ٹانگیں رکھنے والی تمام انسان نما مخلوق انسان کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔

سورۂ فرقان میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَرَءَ یۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ اَفَاَنۡتَ تَكُوۡنُ عَلَيۡهِ وَكِيۡلًا O اَمۡ تَحۡسَبُ اَنَّ اَكۡثَرَهُمۡ يَسۡمَعُوۡنَ اَوۡ يَعۡقِلُوۡنَ اِنۡ هُمۡ اِلَّا كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ سَبِيۡلًا (44-43:25)

''کیا آپ (ﷺ) نے اس شخص کو دیکھا جس نے خواہش نفس کو معبود بنا رکھا ہے تو کیا آپ (ﷺ) اس پر نگہبان ہو سکتے ہو؟ یا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ان میں اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں؟ (نہیں) یہ تو چوپایوں کی طرح کے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔''

گویا ـــــ ایسے انسان جو اپنی خواہشات کے تحت ہی زندگی گزار رہے ہیں اور کمانا ـــــ اچھا کھانا ـــــ سونا ـــــ اور عیش وعشرت کے علاوہ کوئی مطمع نظر نہیں ہے۔ ایسے لوگوں سے اپنی خواہشات کو اپنا 'معبود' بنالیا ہے اور ایسے لوگوں کو اگر قرآن پاک سنا بھی دیا جائے وہ کبھی کبھار درسِ قرآن یا وعظ ونصیحت کی محفل میں حاضر ہو بھی جائیں تو بھی ان کے دل نرم نہیں پڑتے اور وہ ہدایت قبول نہیں کرتے۔ ایسے لوگ حقیقتاً قرآن مجید کی بات تو سنتے ہی نہیں اور عقل سے کام ہی نہیں لیتے۔ ایسے لوگ تو انسان کہلانے کے مستحق ہی نہیں۔ یہ تو جانوروں کی مانند ہیں جو صرف جبلی تقاضوں کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں کوئی اعلیٰ مقصد حیات نہیں رکھتے بلکہ زیادہ گمراہ ہیں اسی طرح کے لوگ آپ ﷺ کی مجلس میں بھی حاضر ہوتے تھے۔ مگر وہ سن کر اصلاح قبول نہیں کرتے تھے۔ دل کہتا بھی تھا کہ اصلاح کرلو توبہ کرلو تو اُسے ٹال دیتے تھے۔ ایسے ہی ایک متمول شخص کا تذکرہ اشارتاً قرآن پاک میں آیا ہے سورۂ مدثر میں ارشاد ہے۔

ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا O وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا O وَّبَنِیْنَ شُهُوْدًا O وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِیْدًا O ثُمَّ یَطْمَعُ اَنْ اَزِیْدَ O (15-11:75)

''ہمیں اس شخص سے سمجھ لینے دو جس کو ہم نے اکیلا پیدا کیا۔ اور مال کثیر دیا۔ اور (ہر وقت اس کے پاس) حاضر رہنے والے بیٹے (دیئے) اور ہر طرح کے سامان میں وسعت دی۔ ابھی خواہش رکھتا ہے کہ اور زیادہ دیں۔''

اتنی نعمتوں اور آسائشوں کے باوجود اس کا حال یہ ہے کہ وہ ہماری آیات سے دشمنی رکھتا ہے۔ اس لئے کہ اس نے آپ ﷺ کی لسانِ مبارک سے قرآن پاک سنا سمجھا مگر ـــــ

اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ O فَقُتِلَ كَیْفَ قَدَّرَ O ثُمَّ قُتِلَ كَیْفَ قَدَّرَ O ثُمَّ نَظَرَ O ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ O ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ O فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ یُّؤْثَرُ O اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ O (25-18:74)

''اس نے فکر کیا اور تجویز کی۔ یہ مارا جائے اس نے کیسی تجویز کی۔ پھر یہ مارا جائے اس نے کیسی تجویز کی۔ پھر تامل کیا۔ پھر تیوری چڑھائی اور منہ بگاڑ لیا۔ پھر پشت پھیر کر کہا یہ تو جادو ہے جو (اگلوں سے) متصل ہوتا آیا ہے۔ (پھر بولا) یہ (اللہ کا کلام نہیں بلکہ) بشر کا کلام ہے۔''

اس شخص نے قرآن پاک سنا، دل نے جھنجھوڑا مگر دل کی بات کو چھپا کر زبان سے انکار کر دیا۔ دوسری جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا وَتَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَايُبْصِرُوْنَ (198:07)

''اور اگر آپ (ﷺ) ان کو سیدھے رستے کی طرف بلاؤ تو سن نہ سکیں۔ اور آپ (ﷺ) انہیں دیکھتے ہو کہ (بظاہر) آنکھیں کھولے آپ (ﷺ) کی طرف دیکھ رہے ہیں مگر (فی الواقع) کچھ نہیں دیکھتے۔

گویا ظاہراً محفل میں موجود ہیں دیکھ رہے ہیں مگر بات سمجھتے نہیں نہ سمجھنے کا ارادہ ہے نہ نیت ہے لہٰذا ـــــ بات اُن کی سمجھ میں آتی ہی نہیں۔ ہدایت تو اسے ملے گی جو اس کا طالب ہو۔ بغیر طلب، بغیر شوق، بغیر تڑپ اور بغیر جستجو کے طلب صادق کا اظہار نہیں ہوتا اور طلب صادق کے بغیر ہدایت نہیں ملتی ان لوگوں میں طلب صادق ہی نہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے طرزِ عمل اور ہدایت کے نہ ملنے کا نقشہ سورۂ یونس میں بھی سامنے رکھا گیا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَايَعْقِلُوْنَ O وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ O اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ O (42:10 تا 44)

''اور ان میں بعض ایسے ہیں کہ آپ (ﷺ) کی طرف کان لگاتے ہیں تو کیا آپ (ﷺ) بہروں کو سناؤ گے اگرچہ کچھ بھی (سنتے) سمجھتے نہ ہوں؟ اور بعض ایسے ہیں کہ آپ (ﷺ) کی طرف دیکھتے ہیں تو کیا آپ (ﷺ) اندھوں کو رستہ

کھاؤ گے اگرچہ کچھ بھی دیکھتے (بھالتے) نہ ہوں، اللہ تو لوگوں پر کچھ ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔''

اس کے برعکس جن لوگوں میں حق کی جستجو اور طلب صادق ہوتی ہے ان کو بالآخر ہدایت مل جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کو لازماً ہدایت عطا فرما دیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ O

(69:29)

''اور جن لوگوں نے ہمارے لیے کوشش کی ہم ان کو ضرور اپنے رستے دکھا دیں گے۔ اور اللہ تو نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔

لہٰذا ـــــ درسِ قرآن کی تیاری اور پھر درس دینے کے دوران اور اس کے بعد خود اپنے اندر بھی اور اپنے سامعین پر بھی نظر رہے اور لوگوں کے رویوں سے دیکھیں کہ کون آگے بڑھ رہا ہے اور کون وہیں کھڑا ہے۔ اس وضاحت کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں سے زیادہ توقعات وابستہ نہ کریں۔ بعض اوقات مدرس کسی خاص وضع قطع کے انسان سے توقعات وابستہ کر لیتا ہے مگر کسی وجہ سے وہ شخص قرآن مجید کے قریب نہیں آتا اور مدرس کی توقعات پوری نہیں ہوتیں تو ایسے موقع پر اپنے اندازِ بیان، لہجے اور گفتگو پر بھی نظر ڈالنی چاہئے کہ مجھ سے کوئی خطا نہیں ہو رہی ہے۔

اور ـــــ اگر خطا ہو رہی ہے تو اللہ سے معافی طلب کرنی چاہئے اور نہیں تو سامعین کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ سے ہدایت کی دُعا کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ قرآن مجید انسانوں کے لئے ہدایت ہے اور جو 'انسان' قرآن مجید کے قریب نہیں آیا۔ اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں یا تو وہ شخص ہمارے اندازِ بیان کی وجہ سے قریب نہیں آ رہا یا واقعتاً 'انسان' نہیں۔ پہلی صورت پر خود غور کرنا چاہئے اور دوسری صورتِ حال کو اس شخص کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہوئے اُسی اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا چاہئے۔ (جاری ہے)

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَ عَلَّمَهٗ (الحدیث)

نوع انسانی پر
رسول اکرم ﷺ کے احسانات

(حصہ اوّل)

ڈاکٹر مقصود احمد (مردان)

یہ اس کائنات و موجودات کی ایک جلی حقیقت ہے کہ علم، قدرت اور طاقت کا منبع و سرچشمہ اللہ کی ذات ہے اور انسانی فکر و عمل کا منتہائے مقصود اس عظیم المرتبت اللہ کو پالینا ہے۔ اللہ کے تعارف کا سب سے مستند ذریعہ رسول عربی ﷺ کی ذات بابرکات ہے اور رسول ﷺ سے قرب و محبت ہی انسان کو محبت الٰہی سے سرشار ہونے کا اعزاز بخشتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک انسان رسول عربی ﷺ کی محبت سے خالی ہو اور اس کا سینہ محبت الٰہی کا مخزن بن سکے۔، گویا توحید کا رمز شناس بننے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی محبت ایک لازمی اور لابدی امر ہے۔ کسی ہستی سے ایک لازوال محبت استوار ہونے کے لئے اسی ہستی کے کمالات اور احسانات ایک مضبوط اور محکم بنیاد فراہم کرتے ہیں چنانچہ بالکل سچ کہا گیا کہ الانسان عبد الاحسان رسول اللہ ﷺ سے ایک غیر متزلزل محبت قائم ہونے کے لئے از بس ضروری ہے کہ ہم آں جناب ﷺ کے کمالات اور احسانات کا ایک گہرا اور ستھرا فہم و ادراک حاصل کریں۔ پس ترتیب یہ بنی کہ اس کائنات کی ایک عظیم و جلیل حقیقت توحید ہے۔ توحید کے تعارف کا واحد مصدقہ ذریعہ محمد ﷺ کی ذات ہے اور محمد ﷺ کی ذات سے کسب فیض کے لئے شاہدرہ محمد ﷺ سے گہری محبت ہے۔ محبت رسول ﷺ کے اس قدر کی قدر شناسی سے نہ صرف انسان کو محبت الٰہی کی کلید ملتی ہے بلکہ یہ ملکہ خود اس محبّ انسان کی

فکری عظمت اور اصابت کا ایک ثبوت فراہم کرتا ہے کہ دنیا کے اندر تو بے شمار انسان بستے اور بے شمار چیزوں سے محبت کرتے ہیں مگر تمام محبتوں میں ممتاز اور منفرد محبت کا شرف اس انسان کے حصہ میں آیا جسے محبت رسول ﷺ کی دولت نے بے بہا نصیب ہوئی کہ بقول عارف رومی:

مادح خورشید مداح خود است
کہ دو چشمم روشن و نامر مداست
ذم خورشید جہاں ذم خود است
کہ دو چشمم کور و تاریک و بد است

ترجمانی:۔ سورج (کے وجود اور چمک) کی مدح کرنے والا درحقیقت اپنی ہی تعریف کہ رہا ہے کہ میری دونوں آنکھیں روشن، صحیح سالم، قوت بینائی سے مالا مال ہیں۔ جبکہ سورج کے وجود کا منکر خود اپنے ہی نقص کا ثبوت فراہم کر رہا ہے کہ میری دونوں آنکھیں اندھی اور قوت بینائی سے محروم ہیں۔

پھر یہ محبت محض ایک خشک لفظ نہیں بلکہ انسان کو فوری طور پر حرکت و عمل کے راستے پر ڈالتی ہے ایک محبت کرنے والا فکر سے لے کر عمل تک ہر ہر گوشے میں اپنے محبوب کا DUPLICATE بن جاتا ہے اور محبوب کی شخصیت کو اس طور پر جذب کرتا ہے کہ اس کی عام عادات و خصائل کو اختیار کرنا تو درکنار اس کی کسی کڑوی کسیلی بات اور بھاری بھرکم حکم کو بھی ایک لذیذ چیز سمجھ کر نہایت خندہ پیشانی سے قبول کرتا ہے۔ اس کی بہترین مثال ایک شیر خوار بچے سے اپنی ماں کی محبت ہے، جاڑے کی ٹھنڈی راتوں میں ایک بچہ رات کو بار بار اُٹھ کر اپنی ماں کو کس قدر بے چین کرتا ہے لیکن اگر ماں سے کہا جائے کہ چونکہ آپ کا بچہ پوری رات آپ کو بے خوابی کی اذیت سے گزارتا ہے اس لئے چند مہینوں کے لئے اس بچے کو کسی اور عورت کے آغوش میں عارضی طور پر دے دیا جاتا ہے تا کہ آپ سردی کی لمبی لمبی یخ بستہ راتوں کو سکون و اطمینان سے گذار سکیں تو ماں ہرگز یہ بات گوارا نہیں کرے گی اور فوراً کہہ دے گی کہ بچے کی دی ہوئی یہ تکلیف اور بے آرامی کہنے کو تو بے آرامی ہے مگر حقیقت میں ان کو ایک بے پناہ لذت و راحت بخشتی ہے۔ یہ حقیقت بتاتی ہے کہ جس طرح ایک ماں بچے کی دی ہوئی تمام تکلیف اور بے آرامی کو اپنی خوشی اور لذت سمجھتی

ہے اس لئے کہ بچے سے ان کی محبت قائم ہے۔ اسی طرح اگر ایک انسان کو رسول عربی ﷺ سے محبت ہو جائے تو پھر وہ رسول ﷺ کی ہر بات کو سننے کے لئے بے تاب اور ان کے ہر حکم کی پیروی کے لئے سخت بے چین و بے قرار ہو جائے گا۔ پھر وہ محبوب کے حکم کی سختی یا آسانی کو نہیں دیکھتا بلکہ اسے ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر حرز جاں بناتا ہے کہ یہ محبوب کی نظر عنایت ہے کہ اس حکم کی تعمیل کے لئے اس کو منتخب کیا۔ اس حقیقت کو عارف رومی شعر کی زبان میں اس طرح ادا کرتا ہے:۔

از محبت تلخ ہا شیریں شود　　و ز محبت مس ہا زرّیں شود
از محبت درد ہا شافی شود　　و ز محبت دُردہا صافی شود
از محبت دار تختے می شود　　و ز محبت بار بختے می شود
از محبت خار ہا گل می شود　　و ز محبت سرکہ ہا مل می شود
از محبت نار نورے می شود　　و ز محبت دیو حورے می شود
از محبت نیش نوشے می شود　　و ز محبت شیر موشے می شود

ترجمانی: اگر محبّ اور محبوب کے مابین حقیقت میں گہری محبت کا عنصر پیدا ہو جائے تو پھر محبوب کی تلخ چیزیں بھی محبّ کے لئے لذیذ و شیریں اور محبوب کا لوہا اس کیلئے سونا بن جاتا ہے، محبت کا عنصر قائم ہو تو محبوب کا دیا جانے والا درد محبّ کے لئے بہترین شفا اور محبوب کی دی گئی ملاوٹی شراب (درد) اس کے لئے اعلیٰ قسم کی شراب صافی بن جاتا ہے۔ محبت کی وجہ سے محبّ محبوب کے تختہ دار کو اپنے لئے تخت عزت و افتخار اور محبوب کی طرف سے ڈالے گئے بوجھ کو اپنے بخت کی بیداری سمجھتا ہے محبت کی وجہ سے محبوب کے کانٹے پھول بن جاتے اور ان کا گھٹّا بے لذت سرکہ لذیذ شراب (مل) بن جاتا ہے، محبت کی وجہ سے قہریلی بھڑکتی ہوئی آگ ایک پرسکون نور بن جاتی ہے اور ایک بدصورت خوفناک دیو ایک خوبصورت حور کی شکل اختیار کر لیتا ہے، محبت کی وجہ سے محبوب کا پھینکا ہوا تیر ایک شفا بخش دوا بن جاتی ہے اور محبت کی وجہ سے ایک گرجتا چنگھاڑتا شیر چوہا بن کر محبوب کے قدموں میں سر رکھ دیتا ہے۔

رسول عربی ﷺ کے ساتھ اپنے رشتہ محبت کی تازگی کے لئے آیئے دیکھتے ہیں کہ نوع

انسانی پر انہوں نے کیسے کیسے احسانات فرمائے۔

1۔ اللہ کا صحیح تصور:

رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا احسان نوعِ انسانی کو اللہ کے صحیح تصور سے روشناس کرانا ہے۔ان کی آمد سے پہلے قافلہ انسانی ایک عجیب وغریب تذبذب میں حیران وسرگرداں تھا۔ اصل اللہ سے بیگانہ ہو کہ انسان ایک طرف تو اشیائے کائنات کے شرک میں مبتلا تھا تو دوسرے جانب انسانی زندگی میں انسان اپنے جیسے انسانوں کے لئے خداوند بنا بیٹھا تھا۔

یہ عام تجربہ ومشاہدہ کی بات ہے کہ انسان اپنے سامنے حاضر وموجود اشیاء کا بہت جلد عاشق ودیوانہ بن جاتا ہے ایک چیز خواہ وہ کتنی ہی انمول اور بیش بہا کیوں نہ ہو لیکن وقتی طور پر اگر نگاہوں سے اوجھل ہو تو انسان اس سے صرف نظر کر لیتا ہے جبکہ ایک دوسری چیز خواہ پہلی کے مقابلے میں کتنی ہی بے وقعت وحقیر کیوں نہ ہو لیکن وقتی طور پر نظروں کے سامنے ہو کر انسان کو منفعت دے رہی ہو تو انسان اس کا پرستار اور والہ وشیدا بن جاتا ہے۔یہی حقیقت ہے جس کو اقبال مغرب کے حسی تہذیب وتمدن (SENSATE CILTURE) حوالے سے ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

؎ فکر فرنگ پیش مجاز آورد سجود
بینائے کور و مست تماشائے رنگ و بوست

یعنی فرنگی فکر کا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر اس چیز کے سامنے سجدہ ریز ہے جو ظاہر اور خارج میں موجود ہو خواہ وہ حقیقت میں کتنی ہی بے وقعت کیوں نہ ہو۔اس تہذیب کی ظاہر پرست آنکھ تو بے شک کھلی ہے مگر حقیقت پرست آنکھ بالکل اندھی ہو چکی ہے۔

؎ اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

ظاہر پرستی کے اس روگ پر عارف رومی ایک مثال کے ذریعے اس طرح روشنی ڈالتا ہے

؎ بر جمادے رنگ مطلوبے چوں دید
از صغیر ہے بانگ محبوب شنید

ترجمانی: انسان جب یہ دیکھتا ہے کہ اشیائے کائنات (جمادات) مثلاً سورج چاند ستارے اس کو

فائدہ پہنچا رہے ہیں تو بجائے اس کے کہ اس کی نظر ان اشیائے ظاہری کے پردے سے آر پار گزر کر اللہ پر مرکوز ہو جائے کہ اصل منفعت دینے والی ذات تو ان ظاہری اشیائے کے پیچھے اللہ ہی ہے، الٹا انسان ان ظاہری اشیاء کا پرستار بن کر ایک مشرکانہ روش پر چل پڑتا ہے یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ایک شکاری مختلف پرندوں کی بولیاں سیکھتا ہے اور پھر کسی جھاڑی میں چھپ کر شکار کی غرض سے ایک خاص پرندے کی آواز نکالتا ہے۔ وہی آواز رکھنے اور نکالنے والا ایک نر پرندہ جب یہ آواز سنتا ہے تو غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ یہ اس کے مادہ پرندے کی آواز ہے جو جھاڑیوں سے آ رہی ہے۔ اور ایک مادہ پرندہ یہ سمجھتا ہے کہ شاید اس کا ساتھی نر پرندہ جھاڑی میں بیٹھا آواز نکال رہا ہے۔ اس تلاش اور غلط فہمی میں جب یہ پرندہ جھاڑی کے پاس آ کر بیٹھتا ہے تو شکاری فوراً جال پھینک کر اس کو پھنسا دیتا ہے۔ بالکل یہی معاملہ انسان کا ہے۔ وہ اشیائے کائنات کی ظاہری فائدہ رسانی اور منفعت بخشی کو دیکھ کر ان کے سامنے اپنا سر نیاز خم کرتا ہے کہ شاید یہی میرا محسن ہے مگر واقعہ سمجھنے میں وہ محض دھوکہ اور سراب ہوتا ہے۔ اشیائے کائنات کو آلہہ سمجھنے کا یہ حادثہ از آدم تا ایں دم ہر دور اور ہر زمانہ میں انسان کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ اس نے کبھی تو ان اشیاء کے سامنے ماتھا ٹیکا ہے تو کبھی وطنیت کے نام پر پہاڑوں دریاؤں اور صحراؤں کے گن گائے ہیں۔ اشیائے ظاہری کو اِلٰہ سمجھنے کی اس فکری کجی کی چند مثالیں درج ذیل ہیں

(ا) یونان میں ایک دریا SKAMANDROS کے نام سے مشہور تھا اس دریا کے ساتھ ضعیف العقیدہ انسان کی عقیدت کا حال یہ تھا کہ ہر نو بیاہتا جوڑے کے لئے اس دریا کے پانی سے غسل لازمی تصور کیا جاتا تھا اور جو جوڑا اس رسم سے سرتابی اختیار کرتا اسے منحوس اور بدنصیب خیال کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ کھیتوں کو سیراب کرنے کے لئے اس دریا کے کناروں کو بیلچے یا کدال کے ذریعے کاٹ کر نہریں نکالنا بھی ایک ناقابل معافی جرم تھا۔

(ب) گائے کی مثال لیجئے، اس کو بنی اسرائیل میں بھی آلہہ کے درجے کا تقدس حاصل تھا اور آج بھی ہندوؤں کے ہاں اس کا وہی مقام ہے۔ فرض کریں ایک سائنسدان یا محقق ماہر حیوانات یہ خواہش ظاہر کرے کہ گائے کو ذبح کر کے اس کے جسم کی بعض رطوبتوں (SECRETION) سے ایک مہلک بیمارے کے لئے دوا تیار کی جاسکتی ہے تو کیا ایک ہندو گائے کو ذبح کرنے پر آمادہ

ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں وہ تو یہی کہے گا کہ جو چیز اِلٰہ کے مقام پر فائز ہے، اس کی اس سے بڑھ کر بے حرمتی اور کیا ہوگی کہ اسے تحقیق کی غرض سے چیرا اور پھاڑا جائے۔

الغرض یہ تو چند مثالیں ورنہ انسان نے اپنی کوتاہ نظری سے کائنات کے اکثر و بیشتر چیزوں کو ناحق خدائی کے مقام پر لا کھڑا کر دیا تھا اور خود ان اشیاء کے سامنے ایک لاچار اور بے بس غلام کی طرح سر جھکا کر ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں گر چکا تھا، جو چیزیں پرستش کے مقام پر فائز تھیں ان پر تحقیق و تجسّس کر کے انسان کے لئے مفید و منفعت بخش بنانے کی بابت سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ محمد عربی ﷺ نے قرآنی پیغام کے ذریعے اشیائے کائنات کی عظمت کے اس طلسم کو پاش پاش کر دیا اور توحید کے ایک ہی ضرب سے کائنات کو پرستش کے مقام سے ہٹا کر انسان کے لئے تحقیق و جستجو کے مقام پر ایک خدمت گذار کی حیثیت سے کھڑا کر دیا۔ پھر جب کائنات خدائی کے مقام سے معزول ہوئی تو انسان کے لئے ان اشیاء پر فکر اور تحقیق و تجزیہ کا دروازہ کھل گیا اور یوں سائنسی فکر کی رُکی ہوئی کشتی ع اور ہوئی فکر کی کشتی نازک رواں..... کے مصداق پھر سے چل پڑی اشیائے کائنات اب پرستش کی بجائے خدمت کے مقام پر آ گئے اور انسان کو ترغیب و تشویق دے دی گئی کہ ان اشیاء پر غور و فکر کر کے ان کی تخلیق میں کارفرما اس عظیم ربّ کی کاریگری اور صناعی کو ظاہر و آشکار کیا جائے اور تخلیق کائنات میں اللہ کی عظمت کو دریافت کر کے صرف اور صرف اسی کے سامنے اپنی پیشانی کو رگڑا جائے یہ ہے وہ عظیم علمی فکری اور سائنسی انقلاب (SCIENTIFIC REVOLUTION) جو محمد عربی ﷺ کے نوع انسانی پر اس عظیم احسان کے ذریعے برپا ہوا۔ جمادات، نباتات اور حیوانات کی دنیا سے نکل کر انسانی دنیا کی طرف آیئے تو یہاں ایک دوسرا خود ساختہ خدا انسانوں کی گردنوں میں اپنا طوقِ خدائی ڈالے ہوئے تھا، یہ خود ساختہ خدا خود انسان ہی تھا جو کبھی نمرود اور فرعون بن کر اور کبھی قیصر اور کسریٰ کا روپ دھار کر انسانوں کی قسمتوں کا مالک بنا بیٹھا تھا۔ جمادات و نباتات کی خدائی کا طلسم توڑنے کے بعد محمد عربی ﷺ نے ان جھوٹے انسانی خداؤں کی خدائی کو چیلنج کیا اور ایک طویل و جاں گسل جدوجہد کے ذریعے ان کو عظمت کے آسمان سے اُٹھا کر ذلت کی خاک پر پٹخ دیا۔ اسی طرح ایک دوسرے توحیدی ضرب سے انسانی زندگی میں ایک زبردست سماجی انقلاب (SOCIAL

(REVOLUTION) برپا کر دیا، کہ بقول اقبال:۔

تو ہی کہہ دے درِ خیبر کو اُکھاڑا کس نے ؟
شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے ؟
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے ؟
کاٹ کر رکھ دیے کفار کے لشکر کس نے ؟
کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدۂ ایران کو ؟
کس نے پھر زندہ کیا تذکرہ یزدان کو ؟

پہلا انقلاب علمی ،فکری اور سائنسی انقلاب تھا جس کے ذریعے اشیائے کائنات کو پرستش کے موضوع سے ہٹا کر تحقیق کا موضوع بنا دیا جب کہ یہ دوسرا انقلاب انسانی اور سماجی انقلاب تھا جس کے ذریعہ پیغمبر انقلاب نے جھوٹے انسانی خداؤں سے خدائی کی طاقت چھین کر اسے اصل اللہ کی طرف لوٹا دیا اور نہایت واضح اور دوٹوک انداز میں اعلان فرمایا کہ انسان صرف اور صرف ایک ہی قادر مطلق اللہ کا غلام ہے۔ اللہ کے سوا انسانی غلامی کی ہر شکل ایک بدترین قسم کا فساد اور ایک مکروہ استحصال ہے کہ بقول اقبال:

غیر حق چوں ناہی و آمر شود
زورور بر ناتواں قاہر شود

اسی طرح اذہان انسانی سے ان دونوں قسم کی خدائی کا سودا نکالنے کے بعد اصل عظیم المرتبت اللہ کا صحیح تصور روشنی میں آ گیا۔

2۔ انسان کا صحیح تصور:

نوعِ انسانی پر رسول اکرم ﷺ کا دوسرا بڑا احسان انسان کو انسان کے صحیح تصور سے آگاہ کرنا ہے۔ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ اس کے ذہن میں جس قسم کا تصور بٹھایا جائے اور جس ڈگر پر اس کی تربیت کی جائے وہ اسی سانچے میں ڈھل جائے گا۔ یہ بالکل سامنے کی بات ہے جس کی تفہیم کے لئے کسی گہرے غور وفکر کی ضرورت نہیں ہر بچہ جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے اپنی فکری و عملی زندگی میں اسی ماحول کے رنگ ڈھنگ اختیار کرتا ہے۔ بچپن سے اگر انسان کے ذہن

میں درندگی اور خونخواری کا تصور راسخ کیا جائے اور لوٹ گھسوٹ اور چھینا جھپٹی کی عادتیں ڈالی جائیں تو عملی زندگی میں اسی قسم کا ایک حیوان نما انسان برآمد ہو جائے گا اس کے برعکس اگر ایک انسان کو شروع ہی سے اخلاق، ہمدردی، بھائی چارے اور غم گساری کا ماحول مل جائے تو نتیجتاً ایک اصیل و شریف انسان وجود میں آجائے گا۔ محمد عربی ﷺ کی آمد سے پہلے انسان کا ذہن انسان کے بارے میں نہایت ہی ٹیڑھے اور بھونڈے تصورات کی آماج گاہ بن چکا تھا۔ جس نے بالآخر انسان کو مایوسی اور ناامیدی کے گھٹا ٹوپ اندھیاروں میں دھکیل دیا تھا۔ فکری غربت اور ذہنی پس ماندگی پر مبنی دور قدیم کی یہ نامبارک میراث آج بھی بالکل ناپید نہیں چنانچہ یورپ میں چوٹی کے فلسفیوں اور دانشوروں کی جھرمٹ میں ایک عرصہ دراز گزارنے کے بعد ڈاکٹر اقبال انسان کے بارے میں وہاں کے انسان کی افسوس ناک فکری نارسائی پر ان الفاظ میں نوحہ کناں ہیں: (ارمغان حجاز)

؎ چناں از خویشتم بیگانہ بودم
چوں دیدم خویش را نشناختم من

ترجمانی: وہاں (یورپ میں) تو میں (اقبال) اپنی (انسان کی) عظمت شناخت سے بیگانہ ہو چکا تھا اور جب اپنے آپ پر نگاہ ڈالی تو خود کو پہچان نہ سکا۔ (پیام مشرق)

؎ بیا اقبال جامے از خمستانِ خودی درکش
تو از میخانہ مغرب ز خود بیگانہ می آئی

ترجمانی: آؤ اقبال اور انسان کی اصل حیثیت و شناخت کے میکدے سے انسانی معرفت کا ایک جام شراب پی اور تو مغرب سے ایسے حال میں آیا ہے کہ اپنی انسانی عظمت اور شناخت سے بیگانہ ہو چکا ہے انسان کے ذہن میں انسان کے بارے میں یہ لنگڑے اور لولے تصورات مندرجہ ذیل تھے۔

(جاری ہے)

قطعہ

قیامت چل پڑی ہے، آ رہی ہے
اشارے پہلے بھیجے جا رہی ہے
دھماکوں، آندھیوں، سونامیوں سے
نشاں اپنے ہمیں دکھلا رہی ہے

فیض عادل فاروقی

اجتہاد، اختلافِ محمود اور تفرد
ایک تحقیقی مطالعہ

حافظ مختار احمد گوندل

اسلام تمام عالم انسانی کے لیے ابدی ضابطہ حیات اور تا قیامت انسانی مسائل کا حل ہے۔ آخری دین اور آخری شریعت کے حوالہ سے ہر عہد کی قیادت و رہبری کا اس میں وصف کامل ہے۔ اس میں جہاں خلوَتوں، جلوَتوں، سلطنتوں اور تمدنوں کے لیے تابانیاں اور جلوہ سامانیاں موجود ہیں وہاں طبائع انسانی میں نشیب و فراز اور تغیرات کے نتیجہ میں پیش آنے والے مسائل کی رہبری کا پورا نظام بھی موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ارتقائے انسانی کی تجلیات جو عصر حاضر میں ہمیں نظر آتی ہیں وہ تمام اسلام ہی کی مرہونِ منّت ہیں۔ اور اس کا منتہائے مقصود دنیا میں ''الخلق عیال اللّٰہ'' کی عملی تعبیر پیدا کرنے کی وہ نوید جاں فزا ہے جس سے بنی نوعِ انسان رنگ، نسل اور وطنیت کے امتیازات سے بالاتر ہو کر اخوت و شفقت کے دامن میں سمو جائیں۔ انسانی ہیئت اجتماعیہ کے لیے اسلام میں اس الٰہی دستور العمل کی بنیاد رسالت محمدیہ ﷺ کے مبارک دور میں ہی پڑ چکی تھی۔

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفل ایام را اُو رسل را ختم، و ما اقوام را
از رسالت در جہاں تکوین ما از رسالت دین ما آئین ما

''اللہ تعالیٰ نے ہمیں شریعت کاملہ سے نوازا۔ ہمارے رسول ﷺ پر نبوت و رسالت

کی تکمیل فرمادی۔ رونق کائنات ہماری وجہ سے ہے۔ آپ ﷺ خاتم المرسلین اور ہم آخری امت ہیں۔ اتباعِ رسالت محمدیہ ﷺ میں ہی ہماری بقا مضمر ہے۔ رسالت محمدیہ ﷺ ہی اب دین انسانیت اور آئین اقوام عالم ہے۔'' (رموزِ بے خودی، 102،101)

آپ ﷺ خاتم الانبیاء ہونے کے ناطے ازل تا ابد دنیا کے قدیم اور جدید تاریخی ادوار میں ایک واسطہ کی حیثیت رکھتے ہیں سلسلہ وحی کے اعتبار سے آپ کا عہد قدیم سے تعلق ہے جبکہ علم وحکمت اور اجتماعی پیشوائی کی حیثیت سے آپ ﷺ قیامت و مابعد قیامت یعنی ابد تک آپ کی نبوت کے نورانی سرچشموں سے خلق مستفیض ہوتی رہے گی۔ اب نہ تو کوئی نیا نبی اور نہ ہی کوئی وحی الٰہی نازل ہوگی۔ مسلسل تغیراتِ انسانی کے لیے فلاحِ انسانیت کا یہ سلسلۂ شریعت یا قانون الٰہی کی روشنی میں جاری وساری رہے گا۔ شریعت اسلامی کی جامعیت اور رہبری دراصل اجتہاد کی بدولت ہے۔ شریعت اسلامیہ مذہب وحکومت کے علیحدہ علیحدہ تصور کو رد کرنے کے ساتھ ساتھ مذہبی پیشوائی یا مشیخیت کو بھی قبول نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں فقہی ارتقاء دورِ نبوی ﷺ سے ہی شروع ہو چکا تھا۔ رحمت عالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''انما اقضی بینکم فیما لم ینزل علی فیه'' (ابوداؤد، کتاب الاقضیہ، 3585)

''میں تمہارے درمیان ایسی چیزوں کے بارے میں خود فیصلہ کرتا ہوں جن کی بابت مجھ پر وحی نازل نہیں ہوتی۔'' یعنی آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجتہاد کے مجاز تھے اور آپ ﷺ کا اجتہاد بھی وحی الٰہی میں شامل تھا۔ جیسا کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب خطباتِ بہاولپور میں فرماتے ہیں:

''اگر اجتہاد کی اجازت نہ دی جاتی تو سب لوگوں کو صرف قرآن وحدیث پر اکتفا کرنی پڑتی اور ممکن تھا کہ کسی وقت بڑے سے بڑے عالم اور فقیہ کو کسی نئے مسئلے کے متعلق نہ قرآن میں کوئی حکم ملے اور نہ حدیث میں۔ آپ نے پڑھا ہوگا کہ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک فیصلے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کچھ توجہ دلائی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بے ساختہ کہا ''لَوْلَا علیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ''۔ اس اجازت کے تحت جو معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو دی گئی تھی کہ ''اجتہاد کرو'' اجتہاد کا اصول ہاتھ آ گیا اور

دشواریاں ختم ہوگئیں'' (ص104)

یعنی قرآن وحدیث میں اگر سکوت ہوتو معاملات کے سلجھانے میں صلاحیتیں، تجربے، عقل سلیم اور فکری استعداد سے ایسا ضابطہ استنباط کریں جسے اجتماعی ضمیر قبول کرے اور معاشرہ میں اجتہاد کے ذریعے مسائل حل ہوں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اجتہاد فرمایا کرتے تھے۔ قاسم ابن محمد تحریر کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر وعمر اور عثمان وعلی رضی اللہ عنہم عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں فتاویٰ دیتے تھے۔ (طبقات ابن سعد 235/2)

اجتہاد کا لفظ ''جہد'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی مشقت وکلفت کے ہیں۔ یعنی عصری ذرائع ووسائل انسانی اور قرآن وسنت کی روشنی میں آخری درجہ تک تمام وسائل اور صلاحیتوں کا ایسا استعمال کہ اس مجتہد کے لیے اس سے زیادہ ممکن ہی نہ ہو، اجتہاد کہلاتا ہے۔ یہ خواہ انفرادی سطح پر ہو یا اجتماعی۔ اس اجتہاد کے اگرچہ نتائج وثمرات گو مختلف ہوں تاہم اسالیب ومناہج کے اعتبار سے شریعت کے جملہ مقاصد اور اسکی تمام جہتوں سے ہم آہنگ ہو۔ اجتہاد دراصل شارع کی ہدایات و تعلیمات کے اطلاق کو وسیع کرنا، اور ان تمام ممکنہ صورتوں کو جو نصوص میں صراحتاً مذکور نہ ہوں کی وضاحت ہے۔ علامہ بیضاوی نے اس کی تعریف یوں کی ہے:

''هو استفراغ الجهد فی درك الاحكام الشريعة'' (منہاج الوصول 3/284)

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ تفصیل کے ساتھ اس کی تعریف یوں فرماتے ہیں:

''اجتہاد فروعی شرعی احکام کو اس کے تفصیلی دلائل سے اخذ کرنے میں پوری پوری سعی وکوشش کرنے کا نام ہے، یہ دلائل بنیادی طور پر چار ہیں: 'کتاب اللہ، سنت، اجماع اور قیاس' اس سے معلوم ہوا کہ چاہے اس مسئلہ پر گذشتہ علماء نے بھی بحث کی ہو یا نہ کی ہو، اب اجتہاد کرنے والا گزشتہ علماء کی رائے سے اتفاق رکھتا ہو یا اختلاف، احکام کے مآخذ یعنی دلائل اور مسائل اور مسائل کی صورتوں سے آگہی میں کسی اور نے بھی تعاون کیا ہو یا نہ کیا ہو، بہرصورت یہ کوشش اجتہاد ہے۔'' (عقد الجيد :6)

اصطلاحی اعتبار سے احکام شریعت کی تحقیق کے لیے استدلال واستنباط اور آیات و علامات کے ذریعہ نتائج حاصل کرنے کی ہر وہ سعی بلیغ جس سے نئے پیدا ہونے والے مسائل کا

امکانی حل موجود ہو، اجتہاد کہلاتا ہے۔ اجتہاد عقل انسانی اور وحی الٰہی کا حسین امتزاج ہے۔ اور یہ وہ انسانی ذہنی وفکری ارتقاء ہے جسے قرآن کریم میں تفقہ، تدبر، تفکر جیسے اہم الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے عقل و ذہانت کے استعمال کے لیے ہی یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عقل انسانی جس قدر وحی الٰہی اور تزکیہ وطہارت سے مربوط ہوگی اور مجتہد عمیق فہم کا حامل ہوگا اس سے غلطی کا امکان کم ہوگا۔ عہد رسالت و مابعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم احکام شریعہ کی تطبیق وتنفیذ کی کامل صلاحیتوں کے حامل تھے اور فقہاء نے بھی اُنہی کی اشباہ ونظائر کو بنیاد بناتے ہوئے قیاس واجتہاد کے ذریعے مسائل کا حل تلاش کیا۔ جس کی بناء پر آج اقوامِ عالم میں اسلام اور اہل اسلام کا قانون سازی میں نمایاں مرتبہ نظر آتا ہے۔ قرآن وحدیث قانون سازی کے بنیادی مآخذ تو موجود تھے لیکن جہاں نئے نئے مسائل درپیش ہوتے تو انہی کی روشنی میں قانونی مباحث کے ذریعے قوانین کی تدوین کی جاتی رہی اور اجتہاد، قیاس اور استدلال وغیرہ اُمت مسلمہ کو ایسے ذرائع میسر آئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جہاں قرآن وحدیث کی اتباع کی جاتی رہی وہاں ہر دور میں قرآن و حدیث کی روشنی میں قابل عمل ضوابط بھی وجود میں آتے رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے متصل خلافت راشدہ ہے اور اس وقت تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے 'معتمد علیہ' اور تربیت یافتہ اصحاب کی کثیر تعداد موجود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں ایک 'راوی' کی بات پر بھی فیصلہ آسان تھا۔ قرب زمانی و مکانی کی وجہ سے جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہر فیصلہ کو قبولِ عام کا درجہ حاصل تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس دور بابرکات میں کسی 'منکر' پر جمع ہو جانا نہ عقلاً ممکن تھا اور نہ نقلاً ثابت ہے۔ ان کی اجتہادی کاوشوں میں انفرادی و اجتماعی دونوں طرح کی کاوشیں شامل ہیں۔ اجتماعی اجتہاد کو ہم اجتماعی مشاورت کا نام بھی دے سکتے ہیں تاہم شرعی اعتبار سے امت مسلمہ پر ان کی اتباع لازم ہے۔ انفرادی و اجتماعی اجتہاد میں ایک پہلو صحت وصواب کا بھی ہے جس میں اجتماعی اجتہاد (LEGISLATIVE ASSEMBLIES) جسے بعض اوقات اجماع کی حیثیت بھی حاصل ہو جاتی ہے کو انفرادی اجتہاد پر فوقیت حاصل ہے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر ہمیں کسی ایسے مسئلہ سے سابقہ پڑے جس کے بارے میں قرآن وسنت میں کوئی واضح حکم امر و نہی کی شکل میں نہ ہو تو ہم کیا کریں؟ اس پر

آپ ﷺ نے فرمایا: شاوروا فیہ الفقہاء العابدین و لاتمضوا فیہ رأی خاصۃ (مجمع الزوائد 178/1)'' (اس کے بارے میں عبادت گزار فقہاء سے مشورہ کرو اور کوئی خاص رائے نافذ نہ کرو) یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر میں اجتہاد مطلق یا انفرادی اجتہاد کا تصور تقریباً مفقود ہوتا جارہا ہے۔ خلفائے راشدین کے عہد میں شورائی اجتہاد کے ادارے اس قدر منظم ہو چکے تھے کہ جنہیں پھر تابعین اور فقہاء نے مزید آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب اس پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''خلفائے راشدین کے زمانے میں کبھی کبھی اجتماعی غور وفکر بھی ہوتا تھا۔ لوگ آپس میں بحث کرتے تھے کہ اس بارے میں کیا کرنا چاہیے؟ ایک صاحب اگر ایک چیز بیان کرتے تو دوسرے صاحب اس پر اعتراض کرتے 'نہیں صاحب!' یہ نہیں ہوسکتا۔ اس میں فلاں خامی ہے یوں کرنا چاہیے اور اس آپس کے بحث مباحثے سے لوگ کسی نتیجہ پر پہنچ جاتے۔ اس زمانے میں خاص کر یہ چیز مفید ثابت ہوئی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے فرمودہ احکام اور اقوال ابھی جمع نہیں ہوئے تھے۔ بخاری، مسلم اور صحاح ستہ کی کتابیں ابھی لکھی نہیں گئی تھیں بلکہ لوگوں کے علم اور حافظے میں تھیں۔ جب آپس میں مل کر مشورہ کرتے تو اس وقت بعض بھولی بسری باتیں یاد آجاتیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن یوں فرمایا تھا۔ اس طرح اسلامی قانون کے متعلق جو معلومات حدیث میں تھیں ان کو جمع کر کے قانونی احکام استنباط کرنے کا آغاز ہوگیا'' (خطبات بہاولپور، ص 104)

اجتہاد دراصل ایک قابل تقسیم صلاحیت ہے یعنی کسی مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں مختلف ماہرین کی صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں۔ یہ قرین فہم ہے کہ ایک فرد علم کے کسی ایک خاص شعبے میں مہارتِ تامہ رکھتا ہو اور وہ مجتہد ہو جبکہ مختلف النوع دیگر موضوعات میں اسے اتنا ادراک واحاطہ نہ ہو اور اس کی حیثیت مقلد کی ہو۔ مثلاً ایک شخص علم طب میں تو مہارتِ تامہ رکھتا ہو لیکن دوسرے علوم میں اس کی معلومات اس درجہ کی نہ ہوں۔ اسی بناء پر اجتماعی اجتہاد کے ادارے معروضی مسائل کے بارے میں مختلف النوع مضامین کے بارے میں متخصّصین کے شرعی نقطہ نظر کو

یکجا کر کے ہی مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کا بنیادی محرک علماء کی وہ مختلف آراء ہیں جو امت مسلمہ کی وحدت کو ٹھیس پہنچاتی ہیں۔ اجتماعی اجتہاد کے نتیجہ میں جو آراء متفقہ یا اکثریت کے ذریعے پیش کی جاتی ہیں وہی قابل عمل تصور کی جاتی ہیں۔ بحث ومباحثہ کے نتیجہ میں جو امور طے کیے جاتے ہیں وہ فیصلے شورائیت کی برکات سے مالا مال ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف اجتہادی فقہی اسالیب استحسان، استصحاب، استصلاح اور مصالح مرسلہ نیز مفاد و مصلحت عامہ کی بنا پر ترجیح و انتخاب یعنی اجتہادِ انتقائی کی صفات سے بھی مزین ہوتے ہیں۔ تاہم بعض فقہاء اجتہاد کو ناقابل تقسیم وحدت قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک چونکہ موضوعات باہمی طور پر مربوط ہوا کرتے ہیں انہیں علیحدہ علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس ضمن میں سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کے تمام فیصلے نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ مثلاً سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مانعینِ زکوٰۃ کے بارے میں لائحہ عمل ایک ایسا ہی منفرد استدلال ہے کیونکہ انہوں نے قیاسی استدلال جو دور رسالت میں بھی مروّج تھا پر زکوٰۃ اور نماز کو مساوی حیثیت دیتے ہوئے اس میں کسی قسم کی تاخیر، ترمیم یا ترخیص گوارہ نہ فرمائی۔ کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ کی توجہ فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

أُمرت أن اقاتل الناس حتى يقولوا: لا اله الا الله، فمن قال: لا اله الا الله، عصم منى ماله و نفسه الا بحقّه و حسابه على الله (بخاری)

کے ان الفاظ الا بحقّه پر مرکوز تھی۔

دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی توجہ حدیث کے پہلے حصہ ''عصم منى ماله و نفسه'' پر تھی۔ اسی بنا پر ان کے مابین یہ مکالمہ بھی ہوا لیکن حالات ونتائج نے یہ ثابت کر دیا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے خلافت علی منہاج النبوۃ کا حق ادا فرما دیا۔

چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ اور سنت کے اعتصام کے ساتھ ساتھ خلفائے راشدین کی سنت (فیصلوں) پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔ فقہاء نے ہمیشہ اپنی آراء اور اختلافی دلائل کو ایسے انداز سے پیش کیا کہ جسے قبولِ عام کا درجہ حاصل ہو۔ لیکن اُمت مسلمہ نے اسی پر عمل کیا جو اکثریت نے واجب التعمیل اور قابل اتباع سمجھا۔ اس کے باوجود امت کے بعض طبقات جو اہل حدیث اور دیگر ناموں سے معروف ہوئے انہوں نے گو اپنی فکر کو مقدم جانتے

ہوئے بھی اُنہی فقہاء میں سے کسی نہ کسی فقیہ کی آراء کا انتخاب کیا اور ان پر عمل کیا۔

جب فکر انسانی اجتہادی مراحل میں داخل ہوتی ہے تو اسے پہلا سابقہ جس حقیقت سے پڑتا ہے وہ اختلاف ہے خواہ وہ اختلاف محمود ہو یا مذموم۔ اختلافِ محمود وہ تعمیری فکر ہے جو برہان و زماں کی بناء ہوتا ہے۔ اختلافِ برہان یعنی ایسا اختلاف جس کی بنیاد دلیل ونظر اور اخلاص پر ہو۔ اور اختلافِ زماں ایسا اختلاف جو زمانہ، حالات اور عرف کی بنا پر ہو یعنی جب حالات بدل جائیں اور عرف تبدیل ہو جائے تو فقہی آراء واحکام بھی بدل جاتے ہیں۔ اس موضوع پر شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ نے ''رفع الملام عن الائمة الاعلام ''اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ''الانصاف فی سبب الاختلاف ''کے نام سے جامع کتب تصنیف کی ہیں یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

یہ نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی رائے ہے اور یہ میری جستجو کی حد تک بہتر ہے، اگر اور کوئی شخص اس سے زیادہ بہتر رائے مستنبط کرے تو وہ زیادہ صحیح اور درست ہوگی۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ہر شخص اپنی گفتگو میں قابل مواخذہ ہے اور اس کی رائے رد کی جاسکتی ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

جو حدیث صحیح ثابت ہو جائے وہی میرا مذہب ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے:

کہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے مقابل کسی کی رائے اور کلام کی اہمیت نہیں ہے۔

(المیزان الکبریٰ 68.63/1)

اُمت مسلمہ میں اجتہاد، اختلافِ محمود اور تفرد دراصل مجتہدین کی وہ آراء ہیں جو بھلائی اور رحمت کا باعث ہیں۔ جنہیں منبع جود وسخا صلی اللہ علیہ وسلم نے ''اختلاف اُمتی رحمة '' فرماتے ہوئے نوعِ انساں کو فکری آزادیوں کی نوید سے معمور فرمایا۔ لیکن یہ اختلافِ محمود اولیٰ یا غیر اولیٰ اور جواز یا عدمِ جواز کے معاملہ میں شرعی اصولوں سے بھی ہم آہنگ ہوا کرتا ہے۔ ہر مجتہد فقاہت و

اجتہاد کے ذریعے رضائے الٰہی کا خواہاں ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ایک اصولی مؤقف ہے ''کل مجتھد مصیب'' یعنی ہر اجتہاد کرنے والا صحیح ہے لیکن اسی اصول کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے کہ ''المصیب واحد'' یعنی حالات ترجیحاً کسی فردِ واحد کو ہی صحیح کا حق عطا کرتے ہیں۔ گو کسی مجتہد کی آراء، مشاہدات و تاثرات، وسائل، علم، ظروف و احوال اور درجہ کے اعتبار سے 'مصیب' نہ بھی ہو سکیں تو اُنہیں بھی ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کے فرمان کے مطابق ایک اَجر کا مستحق قرار دیا گیا ہے جبکہ 'مصیب' کے لیے تو دوہرا اَجر ہے۔ جیسا کہ فرمان نبوی ہے:

اِذَا حَکَمَ الحَاکِمُ فَاجْتَھَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَاِذَا حَکَمَ فَاجْتَھَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ (صحیح بخاری عن عمرو بن العاص)

''جب حاکم کسی معاملہ میں اجتہاد کرے اور پھر درست رائے کو پالے تو اس کے لیے دو اجر ہیں۔ اور جب حاکم اجتہاد کرے پھر اس سے خطا ہو جائے تو اس کے لیے (بھی) ایک اجر ہے۔''

اختلافِ محمود کا مقصد وحید اخلاص وللّٰہیت کے ذریعے منشائے الٰہی کا حصول ہے جس کے ثمرات سے ہر طبقہ فکر مستفید ہوتا ہے۔ علوم کی وسعت و ہمہ گیریت اسی کا نتیجہ ہے۔ دور جدید میں جسے تحقیق کا نام دیا گیا ہے اسلامی اصطلاح میں اسے اختلافِ محمود سے تعبیر کیا گیا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی موجودگی میں انسانوں کو جو مسائل درپیش ہوا کرتے تھے وہ براہِ راست وحی سے حل ہو جایا کرتے تھے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ میں بھی فقہی کاوشیں مسلسل رہی ہیں۔ یہود میں قوانین صرف وہی نہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں تھے بلکہ ان کے بعد کے ادوار میں مسلسل قانون سازی کے ذریعے اضافے ہوتے رہے۔ خصوصاً تاریخ میں عظیم سلطنت بنی اسرائیل یعنی سیدنا داؤد و سلیمان علیہما السلام کے ادوار کا تذکرہ سورۃ الانبیاء میں تفصیلاً بیان ہوا ہے۔

فَفَھَّمْنَاھَا سُلَیْمَانَ وَکُلًّا آتَیْنَا حُکْمًا وَعِلْمًا وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَالطَّیْرَ وَکُنَّا فَاعِلِینَ (79:21)

ان آیات کی تفسیر صاحب تفسیر مظہری نے یوں فرمائی ہے

(فائدۃ) قال مجاھد کان قول سلیمان صلحا وما فعله داود حکما

والصلح خير وقيل ان داود وسليمان حكما بالوحي وكان حكم سليمان ناسخا لحكم داود وهذا قول من قال لا يجوز للانبياء الحكم بالاجتهاد لانهم مستغنون عن الاجتهاد بالوحي وقال لا يجوز الخطا عن الأنبياء والا ظهر ان حكمهما كليهما كان بالاجتهاد الا ان داود أخطأ وأصاب سليمان فاثنى الله عليه وجاز الخطا في اجتهاد الأنبياء الا انهم لا يقرون عليه قال الحسن لولا قوله تعالى وَكُلًّا آتَيْنا حُكْماً وَعِلْماً لرأيت الحكام قد هلكوا ولكن الله تعالى حمد هذا بالاجتهاد واحتج من قال كل مجتهد مصيب بظاهر هذه الاية حيث قال كلا اتينا حكما وعلما ولا دليل لهم فيه بل قوله تعالى ففهمناها سليمان دليل على ان الصواب ما فهم سليمان دون داود عليهما السلام واما حديث عمرو بن العاص انه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا حكم الحاكم فاجتهد فاصاب فله أجران واذا حكم فاخطأ فله اجر واحد رواه الشيخان في الصحيحين واحمد واصحاب السنن الاربعة عن ابي هريرة والمذكور من غير الترمذي عن عمرو بن العاص فهو حجة لنا لا علينا اذ هو صريح في ان المجتهد يخطي ويصيب وكونه ماجورا حين اخطأ لا يدل على كونه مصيبا لكون الخطاء والصواب متضاد ان وليس المراد انه يوجر على الخطاء بل يوجر على اجتهاده في طلب الحق لان اجتهاده عبادة والخطا عنه موضوع اذ لم ينل جهره وعند الاصابة له أجران اجر الاجتهاد واجر النيل الى الصواب والله اعلم (حديث) (تفسير مظهري)

لیکن مابعد ادوار جو سلطنت بنی اسرائیل کا زوال کہلاتے ہیں ان ادوار میں قومِ یہود اجتہادی طور پر بھی رُو بہ زوال ہوتی چلی گئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دورِ مسعود کے بعد یہود اپنے دینی الہامی ورثہ سے قتل انبیاء اور دیگر تحریفات کی وجہ سے محروم ہو گئے۔

اسرائیلی روایات میں ہے کہ نحمیہ نبی نے 410 ق م عظیم سناگاگ (THE GREAT SYNAGOGUE) قائم کی جس کے صدر عزرا نبی تھے۔ تیسری صدی قبل مسیح

یہودی اکابرین (PEERS) کی کونسل سنھدرین (SANHEDRIN) قائم ہوئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں یہودیوں کا یہی قانون ساز ادارہ تھا۔ 90ء میں یہود ربیوں پر مشتمل جامنیا کی کونسل (SYOND OF JAMNIAH) ایک قانون ساز ادارہ کی حیثیت رکھتی تھی جس کا صدر ناسی (NASI) یا پرنس کہلاتا تھا۔ ان قوانین ساز اداروں کی کاوشوں سے جو لٹریچر وجود میں آیا جدید محققین نے ان میں متنی تحریفات کو ثابت کر دیا ہے جس سے ان قانون ساز اداروں کے پس پردہ اسرائیلی زعماء کی بدنیتی واضح ہوتی ہے۔ بائبل کے عہد نامہ قدیم میں شامل مختلف انبیاء کی کتب ان تحریفات سے لبریز ہیں ان تحریفات کی قرآن نے بھی نشاندہی کی ہے۔ البتہ تورات کی ابدی صداقتوں کو اصولی طور پر نور و رحمت قرار دیا ہے جو غیر محرف ہیں۔

ان یہودی قوانین کا مجموعہ تالمود، ہگادا، ہلاخہ، مدراش وغیرہ ہے جو انہی قانون ساز کونسلوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ لیکن موجودہ انجیل کے عہد نامہ قدیم کی کتاب استثناء اور دیگر عہد نامہ قدیم میں موجود کتب کے علاوہ عصر حاضر کے یہودی فقہی لٹریچر کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہود ایک متمدن قوم کے انداز و اطوار سے یکسر محروم ہیں۔ بنی اسرائیل کی اکثریت (یہودی اکابرین) 'قتل انبیاء' جیسے گھناؤنے اور مسلسل جرم کی وجہ سے ہی آسمانی ہدایت سے محروم ہو کر ملعون و مغضوب بن گئے تھے۔ قوم یہود کے جس ابلیسی گروہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو کچھ کیا وہ آسمانی ہدایت کے باب میں ان کے جرائم کا ایک سیاہ باب ہے۔ تاہم مخلصین بنی اسرائیل جو حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلتے تھے اور چلنا چاہتے تھے (اور ایسے مخلصین کی تعداد نہایت کم تھی)، ان کے لیے اس زمانے میں بھی بہت مشکلات تھیں۔ عیسائیت کی ابتداء پہلی صدی عیسوی میں ہوئی رومیوں کے محکوم یہودی مختلف فرقوں میں تقسیم ہو چکے تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت یہود اپنی شریعت کے بارے میں فکر مند ہو گئے کہ اب یہودی خود ساختہ قانون کا مستقبل خطرہ میں ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اندازِ تبلیغ نے آنے والے خطرات کا احساس پیدا کر دیا تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کرنے کی کوشش کی۔ آغازِ تبلیغ میں نصاریٰ کے وہی عبادت کے طریقے تھے جو یہودیت میں مروّج تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی کے ساتھ ہی انجیل غائب کر دی گئی اور پھر چالیس سال بعد موجودہ اناجیل تحریر میں آئیں۔

مروّجہ بائبل کے عہد نامہ جدید کی ستائیس کتب 50ء اور 150ء کے درمیان تحریر ہوئیں جن میں واقعاتی اختلافات، داخلی تضادات وتناقصات اور متنی تحریفات جابجا موجود ہیں۔ 40ء تک نصاریٰ کے ہاں انجیل کا کوئی مصدقہ مجموعہ نہیں تھا۔ ایک روایت کے مطابق 300 سال بعد موجودہ اناجیل مستند قرار دیتے ہوئے بقیہ کو تلف کر دیا گیا جس کی داستان فرانس کے ایک مشہور مؤرخ 'والٹیر' (VOLTAIRE) نے اس طرح بیان کیا ہے:

''ایک مرتبہ کلیسا کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ جو ستر سے زائد انجیلیں ہیں اور ان کے مندرجات میں اختلافات بھی ہیں، ان میں سے صرف ان انجیلوں کا انتخاب کیا جائے جو قابل اعتماد ہوں۔ انتخاب کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ کلیسا میں ساری انجیلوں کو عبادت گاہ کے مقام کے پاس ایک میز پر جمع کیا گیا پھر اس میز کو ہلایا گیا، جو کتابیں نیچے گر گئیں' ان کو نا قابل اعتماد اور ہلانے کے باوجود جو کتابیں میز پر باقی رہیں' ان کو قابل اعتماد قرار دیا گیا۔ (خطبات بہاولپور، ص 6)''

اسی طرح نصاریٰ کی عالمی کونسلیں اور ویٹی کن مجالس میں منظور کی گئی دستاویزات، فرامین، اعلانات اور منشور کلیسائی قانونی مساعی کی اخلاقی حیثیت بھی ساقط الاعتبار ہی نہیں مضحکہ خیز بھی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک چھ صدیوں کا وقفہ یا 'فترۃ' کا زمانہ آ گیا لہٰذا ان بارہ صدیوں (600 ق م سے 600 عیسوی تک) میں 'اہل حق' یعنی مخلصین بنی اسرائیلیوں کے لیے آزمائش کا دور تھا جبکہ شریر اور 'مغضوب علیہم' طبقہ کے لیے عیش فراواں اور 'من مانی' کا دور تھا کوئی 'نہی عن المنکر' کرنے والا بھی کسی آسمانی کتاب کے حوالے سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ یہود و نصاریٰ کی یہ کونسلیں اور تحقیقی ادارے صرف آسمانی ہدایت سے دور رہنے کی تحقیق کرتے رہے کہ کہیں کوئی ہدایت کی رمق ہمارے قانون اور نظامِ حکومت و ریاست میں نہ آ جائے اس لیے کہ سلطنت روما نے عیسائیت قبول کی تو بھی حکومت کے 'قانون' اور نظامِ عدل میں کوئی سرمو فرق نہیں آیا۔ جبکہ انہی استبدادی حکومتوں کو نصاریٰ کی مذہبی سرپرستی بھی نصیب ہوگئی۔ سینٹ اگسٹائن اور دیگر فلاسفہ نصاریٰ کی (JUST WAR THEORY) کی صورت میں تیغ برہنہ ہاتھ میں

آتے ہی انسانیت سسکنے لگی یہ صورت حال قوم یہود کے لیے ان کے جرائم کی پاداش میں اللہ کا خصوصی عذاب تھا اور وہ اس دور میں خصوصاً یہود جائے پناہ کی تلاش میں دنیا میں مارے مارے پھرتے رہے۔ جو ہاتھ لگا اسے تہہ تیغ کر دیا گیا۔ رومیوں کے مظالم سے سسکتی انسانیت رحمت للعالمین ﷺ کا شدت سے انتظار کرنے لگی۔ ان حالات میں بنی اسرائیل (جو انبیائے کرام کے ماننے والے اور اُصولاً وحی و نبوت اور آسمانی بادشاہت کے علمبردار تھے) کے لیے حضرت محمد ﷺ پر آگے بڑھ کر ایمان لانے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ مگر ایک تھوڑی اقلیت کے علاوہ یہود من حیث المجموع ایمان نہیں لائے۔

خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کے بعد اب سلسلہ وحی کا باب بند ہو چکا ہے۔ لہٰذا آئمہ و مجتہدین کی علمی تحقیقات ہی مسائل انسانی کے حل کا واحد ذریعہ ہیں اور امت مسلمہ کی اس اجتہادی محنت کے لیے اپنے اور پرائے سب معترف ہیں۔ ایک طرف آخری کلام اور آخری ہدایت کی حیثیت سے قرآن کے الفاظ ہی قیامت تک کے انسانوں کے لے رہنمائی کے حامل ہیں جو محفوظ بھی ہیں پھر ائمہ مجتہدین نے فرامین رسول ﷺ کی روشنی میں حق اجتہاد بھی ادا کیا ہے۔ چونکہ یہ علمی تحقیقات صرف غیر منصوص احکام میں ہوتی ہیں قطعیات میں نہیں۔ آدابِ شریعت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے کی جاتی ہیں۔ بحث و تمحیص، مشاورت اور رضائے الٰہی کے حصول کا مشترکہ مقصد وحید ہونے کی وجہ سے یہ کاوشیں افراط و تفریط اور اختلافِ مذموم سے بالعموم مبرا ہوتی ہیں۔ قیاس و اجتہاد کے ذریعے یہ تحقیقات فقط ایسے احکام کے بارے میں کی جاتی ہیں جنہیں قطعی الدلالت ظنی الثبوت یا ظنی الثبوت ظنی الدلالت کہا جاتا ہے۔ کسی چیز کو معروف و منکر قرار دینا صرف قرآن و سنت اور اجماعِ امت کی روشنی میں اخلاص کے ساتھ جستجو پر ہی منحصر ہے جو مجتہدین اسلام کا شیوہ رہا ہے۔ احکام کے استنباط میں وحدتِ اُمت کو پارہ پارہ کرنے والی محض نفسانی خواہشات اور ذاتی اغراض پیش نظر نہیں ہوتیں اس لیے کہ اخوت و اتحادِ امت مسلمہ کو بہرصورت فوقیت حاصل ہے۔ بعض احکام میں مجتہدین تفرد بھی رکھتے ہیں علمی تحقیقات کی گہرائیاں جب انفرادیت کا روپ دھار لیں تو ایسے مجتہد پر 'تفرد' کے لفظ کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

آج نہ معلوم کیوں مغربی افکار کے زیر اثر اسلامی اصطلاحات میں سے 'تفرد' کی

اصطلاح کو اعتزال اور انحرافی رویوں کے حامل افراد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ جس سے عام قارئین اپنی عظیم مخلص اسلامی شخصیات کے اجتہادات اور مستشرقین کے خوشہ چین نام نہاد مفکرین کے مزعومہ عقائد و نظریات کی روشنی میں بنائے گئے نظریات کے فرق کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور اس اصطلاح کے ناروا استعمال سے انتشارِ ذہنی کا شکار ہو رہے ہیں۔

القصہ اسلامی تاریخ میں علومِ قرآن اور علومِ حدیث میں جو نمایاں شخصیات گزری ہیں، اُنہوں نے آپس میں اختلاف بھی کیا ہے مگر یہ بات کسی تشریح کی محتاج نہیں ہے کہ ان فقہی اختلافات اور تفصیلی اجتہادی آراء میں افہام و تفہیم کی راہ بھی اپنائی گئی اور بالآخر کسی بھی خاص مسئلہ میں اِجماع یا جمہور علماء کی آراء کا احترام کیا گیا اور مخصوص حالات میں اختلاف کرنے والے حضرات کی آراء جو کسی وجہ سے مختلف فیہ رہیں وہی اُن شخصیات کے 'تفردات' کا درجہ حاصل کر گئیں اور تاریخ میں اسی طرح اُن کا تذکرہ ہوتا رہا ہے۔ تاہم تفرد کی اصطلاح کے تحت عظیم اسلامی شخصیات اور جدید متنازعہ شخصیات کے 'کام' اور 'نام' کو یکجا کر دینا تو تفرد کے لغوی و اصطلاحی مفہوم کے بالکل برعکس ہے۔ اجتہاد اور تحقیقی مساعی میں اختلاف محمود کا تفرد کی حد تک چلا جانا بھی اُس وقت قابل برداشت ہے جب 'مجتہد' کی باقی زندگی اور مجموعی نظریات و اعتقادات و خیالات اُمت مسلمہ کی مجموعی فکر کے دائرہ میں ہوں۔

حدیث اور پھر روایت حدیث میں خبر واحد اور 'تفرد' کا مقام اور بحث ایک دیگر شئے ہے۔ 'خبر واحد' پر مبنی احادیث اور رواۃ کے تفرد کے بارے میں بھی ایک اہم اور فیصلہ کن بات اُمت مسلمہ کے ہمیشہ پیش نظر رہی ہے کہ 'خبر واحد' راوی کی شخصیت اور اُمت مسلمہ کے اجتماعی فکر و ضمیر سے باہمی مطابقت رکھتی ہو۔ اس ضمن میں روایت و درایت اور جرح و تعدیل کے اُصول و قواعد و ضوابط بھی وضع کیے گئے ہیں۔

خَيْرُ النَّاسِ اَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ (الحدیث)

یورپ جاگ اٹھتا ہے

(گزشتہ سے پیوستہ)

انجینئر مختار فاروقی

2 یورپ کا نظریاتی پس منظر

دنیا کے ہر خطے میں بسنے والے لوگوں کی طرح یورپ میں بسنے والے انسانوں کا بھی تاریخی پس منظر کے علاوہ ایک نظریاتی پس منظر بھی ہے۔نظریاتی پس منظر میں کسی قوم اور انسانی گروہ کے کائنات، تخلیق کائنات، کائنات میں انسان کا مقام اور انسان کے اپنے اعمال (BEHAVIOUR) میں جوابدہی کا یقین یا عدمِ یقین شامل ہے۔

تاریخ انسانی گواہ ہے کہ دنیا میں تمام انسانی گروہوں کے صرف دو طرح کے نظریاتی پس منظر ہیں اور عقلاً یہی ممکن ہے اور ان دو طرح کے ممکنہ نظریاتی پس منظر کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

(i) یہ کائنات، آسمان اور زمین بس ایک 'حادثہ' یعنی اچانک واقعہ کے نتیجے میں وجود میں آ گئی ہے۔اس کے پیچھے کسی 'خالق' یا 'رب' کا کوئی تصور نہیں۔انسان دیگر حیوانات کی طرح خود بخود حیات کے 'ارتقاء' کے نتیجے میں سامنے آ گیا ہے اور حیوانات کی سابقہ ترقی یافتہ شکلوں اور انسانوں میں کوئی بنیادی (QUALITATIVE) فرق نہیں ہے صرف درجے (QUANTITATIVE) فرق ہے۔انسان کو اپنے طرزِ عمل، اخلاق اور عملی زندگی کے رہنما اُصولوں (خوراک، مشروبات، لباس، جنسی تقاضوں کی تسکین کے لئے رہنمائی) انہیں حیوانوں سے لینی چاہئے۔

جیسے حیوانوں کے لئے کوئی 'خیر وشر' کا احساس نہیں ہے، رشتوں کی تمیز نہیں ہے، لباس غیر ضروری ہے، اسی طرح انسانوں کو بھی ان معاملات میں کسی تردد اور پریشانی کا شکار نہیں ہونا چاہئے بلکہ خاموشی سے اس کائنات میں دیگر جانوروں کی طرح 'کھاؤ' پیو اور عیش کرو' کے اُصول کے تحت زندگی گزار دینی چاہئے۔ ایسی قوموں میں انسانوں سے کسی محاسبہ یا طرزِ عمل کے بارے میں باز پرس یا نیکی اور بدی کا کوئی احساس اور اس کے ممکنہ اچھے برے نتائج کا کوئی تصور موجود نہیں ہے اخلاقیات کمزور اور پس ماندہ اقوام اور طبقات کا طرزِ زندگی ہے جبکہ ترقی یافتہ اقوام کا 'چارٹر' دوسرے انسانوں پر زبردستی اپنی بالادستی قائم کرنا، زیادہ سے زیادہ انسانوں کو اپنے ماتحت لاکر ان کا استحصال کرنا، حکمران طبقہ (RULING CLASS) جسے اشرافیہ یا "ELITE" یا مراعات یافتہ طبقہ بھی کہا جاتا ہے اس کا کسی قسم کا محاسبہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ کوئی دوسرا گروہ اُٹھے اور پہلے گروہ کا قتل عام کر کے اس کی جگہ لے لے اور پھر وہ دوسرا گروہ بھی وہی کام شروع کر دے جو پہلے گروہ نے جاری کئے تھے۔

اس طرزِ فکر میں حقوقِ انسانی، احترامِ جان و مال، نظریہ، عقیدہ اور رائے کی آزادی اور اس کے اظہار کی آزادی جیسے الفاظ شاید زبان پر ہوتے ہیں جس سے کمزور طبقات یا کچھ انقلابی لوگوں کو مطمئن کیا جا سکے مگر عملاً زندگی کے تمام شعبوں میں ظلم، استحصال جبر اور معمولی جرائم پر بھی سخت سزائیں اور اذیت دینے کا رواج ہوتا ہے۔ غلام طبقہ، دستکار، مزدور، بچے اور خواتین ظلم اور بربریت کا شکار ہوتے ہیں۔ وسائل رزق صرف مقتدر طبقہ کے لئے ہوتے ہیں عوام کی اکثریت پریشان حال رہتی ہے۔

ایسی اقوام کے ہاں اقتدار کے ابتدائی مراحل میں کہیں اخلاق کردار، مساوات، احترامِ جان و مال کی اصطلاحات زبان زدِ عام ہوتی بھی ہیں تو ترقی کے ساتھ ساتھ اور اقتدار کی طوالت کے نتیجے میں ظلم، بے حیائی، حیوانیت اور درندگی کا شعار عام ہو جاتا ہے اور یوں یہ معاشرے 'وحشی قبائل' سے اُٹھ کر ترقی یافتہ بننے کے بعد دوبارہ عریانیت، بے حیائی، شراب، ناچ گانا اور کمزوروں کے استحصال کی طرح لوٹ جاتے ہیں۔

(ii) دوسری قسم کا نظریاتی پس منظر بھی تاریخ انسانی کی ابتدائے سے ہے اور انسانوں کی

ایک مہذب معاشرے کی تشکیل کے ساتھ ہی یہ نظریاتی پس منظر فروغ پاتا چلا گیا۔ اور وقفے وقفے سے دنیا کے ہر متمدن علاقے اس دوسری قسم کے نظریاتی پس منظر کی اقوام سامنے آتی رہیں جو انسانیت کے لئے امن وآشتی کا پیغام لائیں۔ اس نظریاتی پس منظر کی تفصیل اس طرح ہے۔

یہ وسیع اور عظیم کائنات خود بخود وجود میں نہیں آئی بلکہ اس تخلیق کے پیچھے ایک علیم، خبیر، مقتدر، حکیم، دانا، عالم، سمیع اور بصیر ہستی کی مرضی اور منصوبہ بندی شامل ہے اور خالق کائنات نے اس کائنات کو ایک خاص مقصد کے تحت ہی تخلیق فرمایا ہے اور یہ کائنات آج بھی وسعت پذیر ہے۔ اس کائنات میں زندگی کے کئی مدارج ہے۔ انسان تمام مخلوقات میں سے 'اشرف' اور 'عزت والی مخلوق ہے' یہ خالق کائنات کا دنیا میں 'نائب' یا خلیفہ (VICEROY) ہے۔ جس کا مقصد وجود خالق کائنات کے احکام اور مرضی کے ساتھ دنیا کے معاملات کو چلانا ہے۔ وہ خالق کائنات جسے 'اللہ' یا 'الرحمٰن' کے ناموں سے پہچانتے ہیں ان آنکھوں سے نظر نہیں آتا اور نہ ہی حواسِ خمسہ سے محسوس کیا جا سکتا ہے اس اللہ نے اس کائنات کو ایک با مقصد (PURPOSEFUL) تخلیق بنایا ہے یہ کوئی لہو ولعب کا مظہر یا کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے۔

اس اللہ نے انسان کے لئے ساری مادی کائنات مسخر کر دی ہے اور علم، وجدان، تجسس، عقل اور منطق کی ایسی انمول صلاحیتیں بخشی ہیں جس سے کام لے کر انسان تسخیر کائنات کے باب میں آگے بڑھ رہا ہے۔

اس کائنات میں اللہ نے دیگر مخلوقات کی طرح انسان کی بھی تمام ضروریات کا سامان فراہم کیا ہے اور تمام انسانوں کے لئے کیا ہے۔ مادی اور جسمانی ضروریات کے ساتھ ساتھ انفرادی واجتماعی رہنمائی بھی بخشی ہے۔ زندگی گزارنے کے لئے ابتدائی رہنمائی انسان کے 'دل' یا 'فؤاد' میں ڈال دی ہے اور انسان کا صرف مادی وجود ہی نہیں ہے جو نظر آتا ہے بلکہ اس مادی وجود کے ساتھ ایک روحانی وجود بھی ہے۔ اس جسم کے ذرائع علم حواس خمسہ ہیں تو اس روح انسانی کے الگ جانے پہچانے ذرائع علم ہیں جس سے انسان نیکی وبدی میں تمیز کے ساتھ ساتھ اپنے روحانی وجود میں موجود ایک طلب اور تڑپ یا آرزو کے زیر اثر اپنے خالق ومالک اور رب جو اللہ ہے کی معرفت کے حصول کے لئے کوشش کرتا ہے اور اللہ کے احکام کے اندر اندر رہ کر صحیح زندگی گزارے

تو اپنے ’اللہ‘ کی معرفت کی اعلیٰ درجات پالیتا ہے۔

اس اللہ نے انسان کی دیگر ضروریات کی تکمیل کے لئے ’دل کے اندر اخلاقی حس‘ (MORAL LAW) یا جسے انگریزی میں (CONSCIENCE) اُردو میں ضمیر، ایک فلسفی کے نزدیک باطنی آواز (INNER VOICE) کہتے ہیں کے علاوہ عملی نمونہ اور اسوۂ حسنہ کے لئے ’مثالی انسان‘ (یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں مطلوب انسانی کردار کے لئے رول ماڈل ـــــ ROLE MODEL) دنیا میں پیدا کئے تا کہ وہ انسانوں کے لئے نمونہ بن سکیں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی رہنمائی کا بھی اہتمام فرمایا۔

ان حضرات کو تاریخ انسانی میں ’نبی‘ (PROPHET) رسول، پیغمبر یا اوتار کہا گیا۔ یہ لوگ بغیر کسی دنیاوی لالچ اور معاوضے کے لوگوں کو اپنے خالق کا پیغام پہنچاتے رہے اور خود بھی اچھے کردار کا مثالی نمونہ پیش کیا۔ ان اچھے کردار کے انسانوں کا دعویٰ یہ تھا کہ خالق کائنات نے انہیں ’چنا‘ ہے اور اپنا کلام ـــــ ’وحی‘ کے ذریعے عطاء فرمایا ہے۔ ہدایت بخشی ہے تا کہ وہ خود بھی اس کے مطابق زندگی گزاریں اور نمونہ بنیں اور دوسرے انسانوں کو بھی اس کی دعوت دیں۔

ان حضرات کی تعلیمات کا اہم حصہ یہ بھی تھا انسان کے لئے یہ دنیاوی زندگی ہی اصل زندگی نہیں ہے بلکہ جسمانی پیدائش سے پہلے ہر انسان کا ایک روحانی وجود تھا جو مادی جسم کے ساتھ اس دنیا میں آزمائش کے لئے جوڑ دیا گیا ہے ’موت‘ کے بعد ایک دوسری زندگی شروع ہوتی ہے۔ عالم برزخ کے بعد تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کر دیا جائے گا۔ ان پیغمبر حضرات کے نزدیک انسان ایک باوقار، باشعور اور ذمہ دار مخلوق ہے۔ اور اللہ کے ہاں مرنے کے بعد دوسری زندگی میں اپنے تمام اعمال کے لئے جوابدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اُخروی محاسبہ کی تیاری کے لئے پیغمبروں کے ذریعے رہنمائی بخشی ان پیغمبروں کو اپنا کلام بخشا۔ یہ کلام ’زُبر‘ صحائف اور کتابوں کی شکل میں انسانیت کو دیا گیا آخری کلام کی قیامت تک حفاظت کا ذمہ لیا اور آخری پیغمبر کی تعلیمات کو تا قیامت ابدی بنایا اور رہتی دنیا تک امر کر دیا۔

اُخروی زندگی میں محاسبہ کے بعد اچھے انسانوں کو اچھا بدلہ ملے گا اور برے انسانوں کو جو انسان دشمن، خدا بیزار، وحی دشمن اور انبیاء کے دشمن تھے بد کردار، عیاش، بدمعاش، ظالم، لوٹ

کھسوٹ کرنے والے سفاک درندے اور بدکار تھے۔ برا بدلہ ملے گا۔ اچھا بدلہ 'جنت' اور دائمی آرام دہ زندگی کی صورت میں ہوگا اور برا بدلہ ـــــ آگ دوزخ اور تکلیف دہ عذاب کی شکل میں دائمی سزا ہوگی۔

دنیا کے مختلف معاشروں تہذیبوں میں آسمانی ہدایت، پیغمبروں، آخرت، وحی، اللہ جو خالق کائنات ہے کے بارے میں مختلف اصطلاحات اور الفاظ مستعمل ہیں۔

گویا پہلے انسان (روح اور جسد کے ساتھ) حضرت آدم علیہ السلام جو نبی بھی تھے سے لیکر آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ہزاروں انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لائے لوگوں نے ان تعلیمات پر عمل کیا مگر وقت کے ساتھ بھلا دیا بعض انبیاء علیہم السلام پر یہ ہدایت 'کتاب' کی شکل میں آئی تورات، زبور، انجیل اور قرآن آسمانی وحی کی مربوط شکل ہے۔ تورات، زبور، انجیل دنیا سے اپنے ماننے والوں کی عدم دلچسپی اور خدا بیزاری کے رویہ کی وجہ سے غائب کردی گئیں جبکہ آخری کتاب اور آخری نبی ہونے کی وجہ اللہ نے اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا اور حفاظت فرمائی کہ یہ کتاب قرآن مجید اپنے اصلی مشن کے ساتھ دنیا میں موجود ہے۔

دنیا کی تمام تہذیبوں، بادشاہتوں، تمدنوں کو اوپر درج دو قسم کے نظریاتی پس منظر کی روشنی میں دیکھا اور پرکھا جاسکتا ہے اور اس سے باہر کوئی معاشرہ ممکن نہیں ہے۔

یورپ کی تاریخ کا یہ المیہ ہے اور اہل یورپ کی بدقسمتی کہ 600 ق م سے قبل بھی اور بعد میں بھی ان کے ہاں جو نظریاتی پس منظر ملتا ہے وہ پہلی قسم کا ہے اور اس پس منظر کی وجہ سے اہل یورپ کا ایک خاص قسم کا مزاج بنتا چلا گیا اور مخصوص قسم کی نفسیات وجود میں آ گئی۔ تاریخ یورپ کے اس ضمن میں کئی ادوار ہیں۔ پہلا دور سائبیرین حملہ آوروں کا دور ہے۔

2 - (i) سائبیرین حملہ آوروں کا دور

روس اور اس کے شمالی اور مشرقی علاقوں سے انسانی طاقت کا سیلاب تاریخ میں ہر چند صدیوں کے وقفے سے کئی بار آیا۔ ان علاقوں میں زندگی کے لئے سہولتوں کا فقدان تھا۔ آج بجلی اور جدید سہولتوں کے ساتھ بھی ان علاقوں میں زندگی دشوار ہے اس سے قیاس کرلیں ہزاروں سال پہلے

کے سائبیریا کے علاقے کی سہولتوں کا جبکہ اس کے برعکس کوہِ ہمالیہ سے نیچے اور کیسپین اور بحراسود کے جنوبی علاقہ جات اور افریقہ میں موسمی حالات، دن اور رات کے متناسب اوقات اور زرعی علاقوں کی وجہ سے زندگی زیادہ پرسکون اور منظّم تھی اور ماحول زیادہ انسان دوست تھا۔ لہٰذا سائبیریا سے آنے والے حملہ آور نیپال، شاہراہ ریشم اور کوہِ قاف کے راستے اس متمدن دنیا پر حملہ آور ہوتے تھے۔

یہ دور تقریباً 800 ق م تک جاری رہا ہے۔ متمدن دنیا کی خوش قسمتی سمجھئے کہ 500 ق م کے لگ بھگ ایران کے نیک دل بادشاہ (جسے قرآن مجید ذوالقرنین کے نام سے یاد کرتا ہے اور بائبل میں سائرس کا نام دیا گیا ہے) نے اپنے ایک سرکاری دورہ میں مقامی لوگوں کی درخواست پر بحیرۂ کیسپین اور بحراسود کے درمیان طویل پہاڑی سلسلہ پر موجود واحد پہاڑی راستہ پر ایک مضبوط بلند اور طویل آہنی دیوار تعمیر کر کے سائبیرین حملہ آوروں کا راستہ روک دیا۔

اس عظیم منصوبہ (MEGA PROJECT) سے ایک طرح روس کے علاقہ میں جمع ہو کر متمدن دنیا پر حملہ آور ہونے والوں کا راستہ رُک گیا مگر اس 'جنگجو انسانی طاقت' کا یہ سیلاب بھلا رُکنے سے کہاں رکنا تھا۔ اس نے مشرق و مغرب کی طرف راستے نکالے ہیں۔ پہلے بھی ازمنہ قدیم میں بعض قبائل مخصوص حالات کے تحت یورپ برطانیہ اور پھر گرین لینڈ سے ہو کر کینیڈا، شمالی امریکہ، میکسیکو وغیرہ جا کر آباد ہوئے تھے۔

تاہم 500 ق م میں اس 'سدّ ذوالقرنین' کی تعمیر کے بعد 'انسانی طاقت کے اس سیلاب کا رُخ کلی طور پر یورپ کی طرف پھر گیا۔

600 ق م سے پہلے جو سائبیرین مقابل آ کر یورپ برطانیہ اور سکینڈے نیوین ممالک میں آباد ہوئے ان کا معاملہ دوسرا تھا ان کو راستے میں کوئی مزاحمتی تہذیب سے سابقہ نہیں پڑتا تھا۔ جبکہ سدّ ذوالقرنین کی تعمیر کے بعد جو قبائل وسطی یورپ میں داخل ہوئے انہیں پہلے سے آباد بعض نیم متمدن قوتوں کی طرف مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

سائبیرین حملہ آوروں کے پہلے دور میں ایسے قبائل تھے جو یونان، کریپ وغیرہ کے علاقے میں آ کر آباد ہو گئے تھے اور بعض قبائل اٹلی، سسلی اور روم میں آ کر آباد ہوئے تھے۔ یہ آبادیاں یورپ کے جنوبی علاقوں سمیت ساحل سے متصل جزائر پر مشتمل تھیں۔

یونانی تہذیب کی اوّلیات اور رومی تہذیب کی اوّلیات اور شروعات میں سائبیرین قبائل کے اوّلین ریلوں میں آنے والے وحشی، غیر متمدن اور سفاک انسانوں کی بڑی تعداد شامل ہے یا ان کی اولادوں پر مشتمل ہے۔

2 - (ii) یونان کی حکومت، نظریات اور تہذیب

یونان کی ابتدائی آبادی بہت قدیم ہے تاہم یہ تاریخی حقیقت ہے کہ سائبیریا سے آنے والے قبائل ان متمدن علاقوں میں آکر جب آباد ہوتے رہے تو دو تین نسلوں بعد معاشرتی رکھ رکھاؤ اور بقائے باہمی (CO-EXISTANCE) کے اُصولوں سے واقف ہوتے چلے گئے اور مہذب ہوتے چلے گئے۔ لہٰذا ـــــ بعد میں آنے والے ریلے کے لوگوں کے مقابلے سابقہ لوگ آرام پسند، سہولت پسند، مہذب ہونے کی وجہ سے مغلوب ہوجاتے تھے۔

سدّ ذوالقرنین کی تعمیر کے بعد یونان کی انسانی آبادی کے ساتھ یہی تاریخی عمل دہرایا گیا ـــــ اور وحشی سیتھین قبائل نے غلبہ حاصل کرلیا اور وسیع علاقے میں پھیل گئے۔ بدقسمتی سے اس تمام آبادی کے انسانوں کا نظریاتی پس منظر اُوپر درج دو اقسام میں سے پہلا تھا۔ یعنی یہ لوگ خداناشناس، وحی ناشناس، اخلاق سے عاری، انسان دشمن اور تہذیب دشمن تھے۔

یونان (GREECE) کے عنوان سے وکی پیڈیا (انسائیکلوپیڈیا) میں معلومات درج ہیں اس میں تاریخ یونان میں آغاز سے 300 ق م تک کی یہ تاریخ درج ہے۔

1 Greece is home to the first advanced civilizations in Europe and is considered the birthplace of Western civilization, beginning with the Cycladic civilization on the islands of the Aegean Sea at around 3200 BC, the Minoan civilization in Crete (2700-1500 BC), and then the Mycenaean civilization on the mainland (1900-1100 BC). These civilizations possessed writing, the Minoans writing in an undeciphered script known as Linear A, and the Myceneans in Linear B, an early form of Greek. The Myceneans gradually absorbed the Minoans, but

collapsed violently around 1200 BC, during a time of regional upheaval known as the Bronze Age collapse. This ushered in a period known as the Greek Dark Ages, from which written records are absent.

یونان ـــــ یورپ کی پہلی ترقی یافتہ تہذیب ہے اور موجودہ مغربی تہذیب کی جنم بھومی بھی۔ بہت پہلے 3200 ق م میں CYCLADIC تہذیب نے AEGEAN کے جزائر میں جنم لیا پھر 2700 ق م میں MINOAN تہذیب نے CRETE میں اُبھری اور اس کے بعد 1900 ـــــ 1100 ق م میں MYCENAEAN تہذیب موجودہ یونان میں پروان چڑھی یہ تہذیبیں لکھنے کے فن سے واقف تھیں۔ تاہم MINOAN تحریریں تا حال سمجھی نہیں جا سکیں اس فن تحریر کو LINEAR A کا نام دیا گیا ہے جبکہ MYCENAEAN تحریروں کو LINEAR B کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ دونوں طرزِ تحریر ـــــ یونانی زبان ہی کی ابتدائی شکلیں ہیں۔ بعد کے طرزِ تحریر نے سابقہ انداز کو اپنے اندر جذب کر لیا جبکہ خود بھی (بعض عوامل کی وجہ سے) 1200 ق م کے قریب معدوم ہو گئی اس دور کو کانسی کا دور کہا جاتا ہے۔ یہاں سے اس دور کا آغاز ہوا جسے ہم یونانی دور جاہلیت کہتے ہیں۔ (یہ دور قریب ہی یروشلم میں حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے عروج اور بادشاہت کا دور ہے جس نے دور دراز علاقوں تک دیرپا اثرات چھوڑے جبکہ بنی اسرائیل میں عالمی تجارت میں بہت نمایاں تھے۔ تاہم بنی اسرائیل بعد میں خود آسمانی ہدایت کے دشمن بن گئے لہٰذا آسمانی ہدایت کے اس دور کو دورِ جاہلی سے تعبیر کر دیا۔) مترجم: اس دور کا تحریری سرمایہ سرے سے معدوم ہے (بالارادہ صاف کر دیا گیا تا کہ تاریخ میں آسمانی ہدایت، وحی، پیغمبر، اخلاق، کردار، عفت پاکیزگی، شرم اور حیا جیسے الفاظ کا استعمال سامنے نہ آ سکے۔ مترجم)

یہ دور یونانیوں کے لئے جیسا تھا مگر 1300 ق م میں حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف لائے اور بنی اسرائیل کو مصر کے فراعنہ سے نجات دلائی۔ اس کے ساتھ ہی فراعنہ کا دور ختم ہو گیا اور ان

کے مشرقِ وسطیٰ اور جنوبی یورپ (یونان اور روم) کے مقبوضات بھی آزاد ہو گئے بعد ازاں 1000 ق م میں مشرقِ وسطیٰ میں یروشلم کے مرکز کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام کی وسیع حکومت قائم ہوگئی اُن کے پر امن اور خوشحالی کے انسان دوست اور علم دوست 40 سالہ دور کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام بادشاہ بنے ان کا دورِ حکومت بھی چالیس سال پر محیط ہے۔اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو لوہے کی خصوصیات کا علم دیا تھا ان کے دور سے ہی BRONZE AGE ختم ہو گیا اور لوہے کے استعمالات اور اسلحے میں استعمال کا دور شروع ہو گیا۔حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تانبے کے استعمال کا علم بھی دیا تھا۔ان کی حکومت اس لحاظ سے تاریخ عالم میں منفرد تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پرندوں اور جانوروں کی زبان سمجھنے کا بھی علم دیا تھا اور ہواؤں کو مسخر کر دیا تھا جس سے دنیا میں سمندری بادبانی جہازوں کے ذریعے منظّم عالم تجارت کو فروغ حاصل ہوا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ھوا کے دوش پر سفر کرنے کا معجزہ عطا فرمایا تھا اور اپنے سلطنت کے وسیع گوشوں میں صبح کو جا کر بعد دوپہر واپسی کا سفر کر لیتے تھے اور یہ سفر ایک طرف کی مسافت میں ایک مسافر کے مہینے بھر کے سفر کے برابر ہوتا تھا۔(القرآن)

حضرت سلیمان علیہ السلام کے دارالحکومت یروشلم کو مرکز بنا کر ایک مہینے کے سفر کے سفر کا اندازہ لگائیں جو 700 ـــــ 750 میل بنتا ہے یعنی 1200 کلومیٹر، یروشلم کو مرکز مان کر دنیا کے نقشے یا گلوب پر 1200 کلومیٹر نصف قطر کا دائرہ لگائیں تو آپ حیران ہوں گے کہ ان کی حکومت کی حقیقی علمداری کہاں تک تھی۔ایک طرف یروشلم سے جنوب کی طرف ملکہ سبا کے دارالحکومت تک اور دوسری طرف شمال میں یورپ کے وسط تک تھی یونان اور روم ان حدود کے اندر آتے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام سے پہلے ہی بنی اسرائیل عالمی تجارت میں دخیل ہو کر آسمانی ہدایت کے علمبردار ہوئے ناطے معزز سمجھے جاتے تھے۔حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت مین بنی اسرائیل کا عالمی تجارت میں عمل دخل بہت بنیادی بن گیا اور وہ اس تجارت پر حاوی ہو گئے۔

اسی دور کو یونانی 'دورِ جہالت' (DARK AGES) کہتے ہیں حالانکہ بنی اسرائیل سے ان کے تعلقات تھے اور بنی اسرائیل آسمانی ہدایت، وحی، نبوت و رسالت، عدل و انصاف، اخلاق اور آخرت پر ایمان کے دعویدار تھے۔بنی اسرائیل نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ہدایت سے

منہ موڑ کر دنیا پرستی کا راستہ اختیار کر لیا۔ تورات اور زبور غائب کر دی انبیاء کرام علیہم السلام کو قتل کرنے کا جرم اختیار کر لیا۔ مگر اس کے باوجود آسمانی ہدایت کے دعویدار بنے رہے۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ان کے یونانیوں کے ساتھ تجارتی تعلقات ہونے کے باوجود بنی اسرائیل نے یونانیوں کو 'اسلام' کی دعوت نہ دی (یاد رہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا دین اسلام ہی تھا اور ہر دور میں پیغمبر وقت کے ماننے والے مسلمان ہی کہلاتے تھے۔ جو لوگ آنے والے نبی/رسول پر ایمان نہیں لاتے تھے وہ اپنے لئے کوئی اور نام تجویز کر لیتے تھے۔)

بلکہ خود بھی دنیا پرستی میں مبتلا ہو کر ایسے بگڑے کہ یونان کی مشرکانہ تہذیب وتمدن اور مشرک فلاسفہ کے نظریات کے قائل ہو گئے اور اس کے موید اور اشاعت کرنے والے بھی گئے۔ اس کے بارے میں یہی انسائیکلو پیڈیا تحریر کرتا ہے۔

2 The end of the Dark Ages is traditionally dated to 776 BC, the year of the first Olympic Games. The Iliad and the Odyssey, the foundational texts of Western literature, are believed to have been composed by Homer in the 8th or 7th centuries BC. With the end of the Dark Ages, there emerged various kingdoms and city-states across the Greek peninsula, which spread to the shores of the Black Sea, Southern Italy (Latin: Magna Graecia, or Greater Greece) and Asia Minor. These states and their colonies reached great levels of prosperity that resulted in an unprecedented cultural boom, that of classical Greece, expressed in architecture, drama, science, mathematics and philosophy. In 508 BC, Cleisthenes instituted the world's first democratic system of government in Athens.

یہ دورِ جاہلی (یعنی آسمانی ہدایت کے تحت پرامن اور ترقی یافتہ تہذیب وتمدن روایتاً 776 ق م میں ختم ہو گیا۔ (جب بنی اسرائیل خود بھی آسمانی ہدایت سے منہ موڑ کر اس

کے دشمن بن گئے بلکہ قتل انبیاء جیسے جرم کے مرتکب ہوئے اور آسمانی ہدایت سے محروم معاشروں سے بھی زیادہ بے راہ ہو گئے بلکہ مغضوب علیہم ٹھہرے۔ مترجم) اسی سال یونان میں (اسی خوشی میں۔ مترجم) اولمپک گیمز کا آغاز ہوا۔ مغربی لٹریچر کی دو بنیادی تحریریں ILIAD اور ODYSSEY جنہیں HOMER نے مدوّن کیا۔ وہ آٹھویں اور ساتویں صدی قبل مسیح میں دورِ جاہلی کے اختتام کے دور کی ہیں۔ اس عرصہ میں یونان میں کئی بادشاہتیں اور شہری ریاستیں (بنی اسرائیل کے زیر اثر اور آسمانی بادشاہت کی نقل میں مترجم) منصۂ شہود پر آئیں جو بحر اسود کے ساحلی علاقوں، جنوبی اٹلی، عظیم یونان اور ملحقہ ایشیائی علاقوں (ایشیائے صغیر) تک پھیل گئیں۔ یہ ریاستیں اور ان کے مقبوضات خوشحالی میں بہت آگے بڑھ گئیں۔ جس کے نتیجے میں زبردست ثقافتی عروج آ گیا جسے فن تعمیرات، ڈرامہ، سائنس، ریاضی اور فلسفہ میں CLASSICAL GREECE کہا جاتا ہے (وحی دشمن، اخلاق دشمن، ضمیر دشمن، حیوانی رویوں پر مبنی موجودہ تہذیب اسی 'کلاسیکل یونان' کا عکس جمیل ہے مترجم) 508 میں CALEISTHENES نے دنیا کی پہلی جمہوری حکومت کی ایتھنز میں بنیاد رکھی۔

ایران کے ایک بادشاہ سائرس جس کا ذکر بائبل میں ہے اور جس نے بخت نصر کی قید سے بنی اسرائیل کو رہائی دلائی۔

اس بادشاہ کو قرآن مجید نے ذوالقرنین کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس نے مغرب کی طرف بحیرۂ روم میں اپنی ایک عسکری مہم میں ایتھنز فتح کر لیا مگر اس کے نتیجے میں یونانیوں کو اسلام کی تبلیغ کے سلسلے کیا اقدامات یونان تو کمتان حق کر ہی رہی ہے مگر بنی اسرائیل کی تاریخ بھی اس سلسلے میں مجرمانہ غفلت کا شکار ہے۔ یونانی سلطنت نے 400 ق م سے 323 ق م تک بڑا عروج پایا اسکندر اعظم نے ایرانی سلطنت کو مفتوح کر لیا اور پنجاب تک آ پہنچا۔ واپسی پر عراق میں وفات پا گیا۔ اس کے بارے میں انسائیکلوپیڈیا رقم طراز ہے۔

3 By 500 BC, the Persian Empire controlled territories ranging from their home Iran all the way to what is now northern Greece and Turkey, and

posed a threat to the Greek states. Attempts by the Greek city-states of Asia Minor to overthrow Persian rule failed, and Persia invaded the states of mainland Greece in 492 BC, but was forced to withdraw after a defeat at the Battle of Marathon in 490 BC. A second invasion followed in 480 BC. Despite a heroic resistance at Thermopylae by Spartans and other Greeks, Persian forces sacked Athens.

''500ق م کے لگ بھگ سلطنت فارس اُبھر کر ایران کے علاوہ مغربی میں شمالی یونان تک بشمول ترکی پر قابض ہوگئی اور یونانی ریاستوں کے لئے حقیقی خطرہ ثابت ہوئی۔(یادرہے کہ سلطنت فارس کا یہ حکمران سائرس ہے جسے قرآن مجید ذوالقرنین کہتا ہے اور بائبل میں اس بادشاہ کی تعریف کر کے بڑا نیک دل بادشاہ کہا گیا ہے اسی بادشاہ نے بخت نصر کی غلامی سے بنی اسرائیل کو (عراق سے) نجات دلائی تھی اور یروشلم میں آباد کرایا تھا۔مترجم) یونان کی ایشیائی شہری ریاستوں کی سلطنت فارس کو گرانے کی تمام سرتوڑ کوششیں ناکام ہوگئیں۔اور سلطنت فارس کی افواج نے یونان کے اپنے علاقوں کو 492ق م میں روند ڈالا۔تاہم جلد ہی میراتھن کے مقام پر 490ق م میں ایک جنگ میں سلطنت فارس شکست کے بعد پیچھے ہٹ گئی۔ 480ق م میں سلطنت فارس کا دوسرا حملہ ہوا THERM OPYLAE کے مقام پر SPARTANS اور دیگر یونانیوں کی طرف سے بھرپور مزاحمت کے باوجود سلطنت فارس نے ایتھنز پر قبضہ کرلیا۔(یہاں بنی اسرائیل کو سائرس کی فتح کی یاد منانا چاہئے جوان کا محسن تھا مگر افسوس کہ بنی اسرائیل آج تک یتھنز کے شیطانی کلچر اور ابلیسی روایات کو سینے سے لگا کر اُسی کے احیاء پر فخر کرتے نظر آتے ہیں۔مترجم)

اس دور پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے انسائیکلوپیڈیا تحریر کرتا ہے۔

4 Following the assassination of Phillip II, his son Alexander III ("The Great") assumed the leadership of the League of Corinth and launched an

invasion of the Persian Empire with the combined forces of all Greek states in 334 BC. Following Greek victories in the battles of Granicus, Issus and Gaugamela, the Greeks marched on Susa and Persepolis, the ceremonial capital of Persia, in 330 BC. The Empire created by Alexander the Great stretched from Greece in the west to Pakistan in the east, and Egypt in the south.

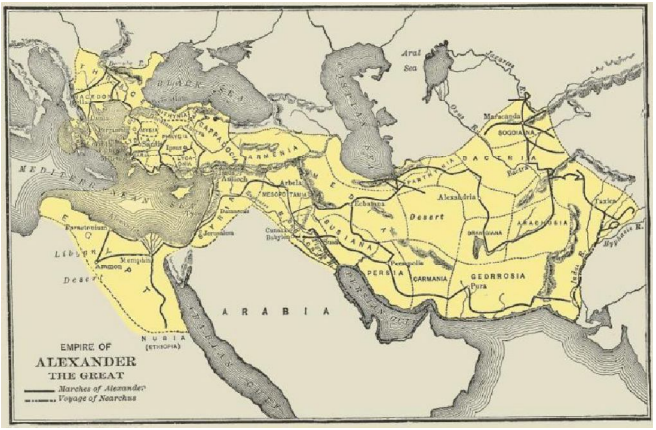

''فلپ دوم کے قتل کے بعد اس کا بیٹا اسکندر سوم (اسکندر اعظم) نے LEAGUE OF CORINTH کی لیڈر شپ سنبھالی اور 334 ق م میں تمام یونانی ریاستوں کی اتحادی افواج کے ساتھ سلطنت فارس کے خلاف مہم جوئی شروع کر دی۔ یکے بعد دیگرے GAUGAMELA, ISSUS, GRANICUS کی کامیابیوں کے بعد یونانی افواج 330 ق م میں SUSA اور PERSEPOLIS تک پہنچ گئیں جو سلطنت فارس کا شاندار دارالحکومت تھا۔ اسکندر اعظم نے جس سلطنت کی بنیاد ڈالی وہ مغرب میں یونان سے لیکر مشرق میں موجودہ پاکستان تک پھیلی ہوئی تھی جبکہ جنوب میں وہ مصر تک محیط تھی۔''

اسکندر اعظم کو موت نے آلیا ورنہ وہ جزیرہ نمائے عرب پر بھی حملہ کر کے 'مکہ' اور عرب

قبائل کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ انسائیکلو پیڈیا میں درج ہے:

5 Before his sudden death in 323 BC, Alexander was also planning an invasion of Arabia. His death marked the collapse of the vast empire, which was split into several kingdoms, the most famous of which were the Seleucid Empire and Ptolemaic Egypt.

''323 ق م میں (پنجاب سے واپسی پر عراق میں شکست خوردہ اسکندر اعظم کی کثرت شراب نوشی اور اخلاقی بے راہ روی کی وجہ عین 33 سال کی جواں سال عمر میں وفات ہوگئی۔ مترجم) اپنی وفات سے قبل، اسکندر اعظم جزیرہ نمائے عرب پر بھی حملہ کی منصوبہ بندی کر رہا تھا اس کی موت سے عظیم یونانی سلطنت برباد ہوگئی اس سلطنت کے بے شمار ٹکڑے ہو گئے جن میں سے اہم SELEUCID EMPIRE اور PTOLEMAIC EMPIRE تھیں۔''

اسکندر اعظم کو جزیرہ نمائے عرب پر حملے سے روک کر قدرت نے بیت اللہ کی حرمت محفوظ کر لی۔ اسکندر اعظم کو کسی نے مشورہ دیا تھا یا (INVITATION) 'حملہ کی دعوت' دی تھی یہ اللہ بہتر جانتا ہے مگر اسی دور میں یہود جس مجرمانہ ذہنی کیفیت سے گزر رہے تھے اس کا تذکرہ مولانا حمید الدین فراہی صاحب نے اپنے تصنیف لطیف 'القول الصحیح فی من ھوالذبیح' میں کیا ہے خلاصہ یہ ہے کہ یہود نے آخری پیغمبر کو بھی حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں ثابت کرنے کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے اور بڑے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو سرے سے انکار کر دیا اور کعبہ، قربان گاہ، چاہِ زم زم، صفا، مروٰی وغیرہ کے فرضی مصداق یروشلم کے آس پاس کہیں بنائے اور کعبۃ اللہ (حرمِ کلی) کا سرے سے تاریخی طور پر انکار کر دیا تھا۔ یہود کے اسی منصوبے پر عمل درآمد 571ء میں ابرہہ نامی یمنی عیسائی بادشاہ کے ذریعے ہوا جس کے یہودی مشیر تھے اور جس کا ذکر قرآن پاک میں سورۃ الفیل میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کعبۃ اللہ کی حرمت اور حضرت محمد ﷺ کی حفاظت کے لئے ابرہہ کے لشکر کو تباہ کر دیا (یاد رہے کہ سیدنا حضرت محمد ﷺ کی ولادت باسعادت عام الفیل میں واقعہ فیل کے چند ہفتے بعد کی ہے۔) (جاری ہے)

مدیر کے نام

01 **الطاف الرحمٰن بنوی (استاذ جامعہ امداد العلوم الاسلامیہ) پشاور صدر**

''صہیونیت'' کے نام سے آپ کی مرتب کردہ کتاب کم وبیش دوعشرے پہلے موصول ہوئی تھی، چونکہ آن محترم نے تأثرات لکھنے کا حکم فرمایا تھا جس کے لئے کتاب کو اوّل تا آخر دیکھنے کی ضرورت تھی، اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی جس پر معذرت خواں ہوں۔

اپنی دینی طالب علمی کے ابتدائی دور میں جبکہ ترجمہ قرآن کی تھوڑی سی شُدبُد حاصل ہوئی تھی قرآن پاک میں بنی اسرائیل کے بتکرار ذکر سے بہت زیادہ حیرت ہوتی تھی اور حیرت کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک ہمیں یہود کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل تھیں عالمی سطح پر یہود کو جو کچھ بھی تسلّط حاصل تھا لیکن ملکی سطح پر اُن کے کسی کردار کا ہمیں کوئی نام ونشان معلوم نہیں تھا۔ اسی طرح سے جب احادیث میں آخری زمانے میں خراسان کی فوجی اہمیت کی طرف اشارات پڑھتے تو بہت تعجب ہوتا کہ یہ خطہ بالخصوص افغانستان تو دنیا کا پسماندہ ترین ملک ہے یہاں کی اکثریت تقریباً ناخواندہ اور نئی روشنی سے بہت دور ہے واللہ اعلم اس اہمیت کی کیا شکل وصورت بنے گی۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ تعجب اور حیرت ختم ہوتی گئی کیونکہ جوں جوں ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا گیا توں توں یہ حقیقت منکشف اور آشکار ہوتی گئی کہ یہودی فتنہ پوری انسانیت کے لئے بالعموم اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص کس قدر زہرناک اور المناک ہے اور یہ چھوٹی سی اقلیت اپنی تیز وطرار اور سازشی ذہنیت کی بدولت کیا کیا کرشمے دکھاتی چلی آرہی ہے اور اب اس کے کیا کیا منصوبے

ہیں اوران پر عمل درآمد کے لئے کیا کیا انتظامات کیے جارہے ہیں۔

اسی طرح سے خراسان کی بابت تیس چالیس سال کی مختصر مدت میں جو تیز رفتار تبدیلیاں واقع ہوئیں اس نے حدیثی حقائق کو دو دو نے چار کی طرح زمینی حقائق میں تبدیل کر دیا ہے۔ میں نے کسی کتاب میں رئیس المفسرین عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول پڑھا تھا کہ مرورِ زمانہ بہت سے قرآنی حقائق خود سمجھا دے گا۔ یہی بات حدیث کے بارے میں بھی بڑے اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے۔ قرآن میں یہود (بنی اسرائیل) کا بتکرار ذکر ہو یا حدیث میں خراسان کے بارے میں پیش گوئیاں ہوں، مرورِ وقت نے دونوں کی بہت کھلی توجیہات و مصداقات پیش کی ہیں اوراب ان قرآنی آیات وحدیثی روایات کو پڑھتے ہوئے نہ صرف یہ کہ کوئی اچنبھا محسوس نہیں ہوتا بلکہ طابق النعل بالنعل کی سی صورت حال سامنے آجاتی ہے اور علم الیقین، عین الیقین میں بدل جاتا ہے۔

میں آپ کو ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے امت کے لئے ایک بہترین سوغات سمجھتا ہوں کئی لوگ محض مصنف بننے کے لیے کتابیں لکھتے ہیں لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ آپ کی ہر تصنیف مقصدیت اور درد دل کا شہکار ہوتا ہے یہودیت کے صہیونی طبقے کی خباثتوں اوران کی پر اسرار سرگرمیوں کو سمجھنے کے لئے میں اس کتاب کو بار بار پڑھنے کے لائق سمجھتا ہوں۔ دورِ انتشار میں یہود کی مدینہ آمد کے بارے میں عام طور پر یہی نقل ہوتا آیا ہے کہ اپنی کتابوں کے مندرجات کی روشنی میں یثرب کو نبی علیہ السلام کا دارالہجرت قرار دیتے تھے چنانچہ وہ اسی لئے یہاں آباد ہوئے تھے کہ ہم ہوں یا نہ ہوں ہماری اولاد تو اس نبوت سے فیض یاب ہوگی لیکن آپ نے اس آمد کو بھی صہیونی سازشی ذہنیت کا کرشمہ بتلایا ہے اوراس میں شک نہیں کہ صہیونی تاریخ ایسی ہی قبل از وقت منصوبوں اوراس پر عملدرآمد کے لئے بہت دوررس کارروائیوں کے لئے مشہور ومعروف ہے، بہت ممکن ہے کہ وہ آخری نبوت سے فیض یابی کے لئے نہیں بلکہ اس کا راستہ روکنے کے لئے مدینہ میں آباد ہوئے ہوں اور جس کی بھرپور تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ باوجود پوری طرح پہچاننے کے وہ نہ صرف ایمان لانے کے لئے تیار نہیں ہوئے بلکہ ہر قدم پر نبی علیہ السلام کے لئے مشکلات پیدا کرنے کی کوشش میں رہے۔

میں یہ کتاب لکھنے پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خیرخواہی اور غم خواریٔ اُمت کی خاطر آپ نے اس کی تالیف میں جو وقت اور توانائی صرف کی ہے اللہ تعالیٰ دین و دنیا میں اس کا بہت بڑا اجر اور صلہ عطا فرمائے اور امت کو اس سے بہت بہت نفع پہنچائے۔ این دعا از من واز جملہ جہان آمین باد۔

02 **محمد عبداللہ شارق، مدیر مرکز احیاء التراث، قدیر آباد۔ ملتان**

مزاجِ گرامی بخیر! ''یاجوج وماجوج'' پر ''حکمتِ بالغہ'' کی خصوصی اشاعت دیکھنے کا اتفاق ہوگیا تھا۔ علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام اور مولانا گیلانی کا سہارا لے کر آپ نے اس سلسلہ میں جس ''تجددی رائے'' کا اظہار کیا ہے، مجھے اس سے اختلاف ہے۔ اگر میں غلط نہیں سمجھا تو آپ کی رائے شاید یہی ہے کہ یاجوج وماجوج اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ اس وقت میدان میں ہیں اور ان کا آخری ''ظہورِ موعود'' ہو چکا ہے، بلکہ آپ کی رائے میں تو ''مسلمانانِ پاکستان وافغانستان نے یاجوج وماجوج کے خاتمے کی طرف بھی تقریباً آدھے سے ذرا زیادہ سفر کرلیا ہے'' (خصوصی اشاعت، صفحہ ۷) اور آپ کی رائے میں ''یہ یاجوج ماجوج ہمارے یا ہماری اولادوں کے ہاتھوں ہی واصل بجہنم ہونے والے ہیں'' (خصوصی اشاعت، صفحہ ۱۴۱) اس لئے آپ کی رائے میں ''یہ ہماری سعادت ہوگی کہ ہم کسی آسمانی مداخلت کا انتظار کئے بغیر خود آگے بڑھیں، اللہ تعالیٰ کی شانِ رحیمی جوش مارے گی اور مسلمانوں کی کم زور جماعت کو یاجوج ماجوج کی مضبوط کیل کانٹے سے لیس جماعت پر غلبہ دے دے گی۔'' (خصوصی اشاعت، صفحہ ۱۴۲)۔ میں حیران ہوں کہ ایک طرف تو آپ یہ کہتے ہیں اور دوسری طرف اس ''صحیح حدیث کو بھی آپ نے اس خصوصی اشاعت میں دو جگہ نقل کیا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ یاجوج ماجوج کا خروج موعود نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوگا تو کیا نزولِ عیسیٰ علیہ السلام ہو چکا ہے یا پھر آپ کی رائے ہی میں کوئی تضاد ہے؟ اسی طرح اس حدیث میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یاجوج ماجوج ''مسلمانانِ پاکستان وافغانستان کے ہاتھوں واصل بجہنم ہوں گے اور نہ ہی ان کے چاہنے سے یہ ''سعادت'' ان کو حاصل ہوسکتی ہے، بلکہ مسلمان تو اللہ کے حکم سے اس وقت مضبوط پناہ گاہ میں چھپ جائیں گے جب یاجوج ماجوج کا خروجِ موعود ہونے والا ہوگا، وہ آئیں گے، تباہی پھیلائیں گے، پھر اللہ ہی

کے تکوینی حکم کے ساتھ ان کا خاتمہ ہوگا اور اس سارے دورانیہ میں مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایک محفوظ پناہ گاہ میں رہیں گے۔ یہ بھی ایک تضاد ہے جو آپ کے موقف میں نظر آتا ہے کیونکہ مسلمانوں کے ہاتھوں ان کے واصل بجہنم ہونے کی بات بھی آپ کرتے ہیں اور پھر اس ''حدیثِ صحیح'' کو بھی آپ بلاتوجیہ نقل کرتے ہیں۔

ہمیں ایک بات ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ ''یاجوج ماجوج'' کا تعین کرنے میں ہمارا کوئی دینی یا دنیاوی مفاد نہیں ہے، ممکن ہے کہ وہ امریکی، روسی اور برطانوی ہی ہوں جیسا کہ آپ کہتے ہیں (خصوصی اشاعت، صفحہ ۷) اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ان نمایاں قوموں میں سے کوئی قوم نہ ہوں، بلکہ کوئی غیر نمایاں قوم ہوں جو ''ظہورِ موعود'' کا وقت آنے پر ظاہر ہوں۔ وہ جو بھی ہوں، ہمیں اس سے کیا غرض؟ ہمارے ایمان کے لئے کیا اتنا کافی نہیں کہ وہ اللہ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے، ذوالقرنین نے ان کے لئے ایک روک کھڑی کی تھی، ممکن ہے کہ وہ اب تک ''برمودا جیسے غیر معمولی اور پراسرار'' کسی جزیرے میں اس ''روک'' کے اندر ہی پڑے ہوں اور ان کا وجود ''وقتِ موعود'' تک باقی انسانوں کے لئے راز ہی رہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ''روک'' کب کی ٹوٹ پھوٹ چکی ہو اور باقی انسانی آبادیوں میں وہ گھل مل چکے ہوں جبکہ وقتِ موعود کے آنے پر وہ ایک خاص وحشیت کے ساتھ ظاہر ہوں۔ فرض کیجئے کہ اگر وہ روسی، امریکی اور برطانوی اقوام ہی ہوں تو اس تعین میں ہمارا کیا دینی مفاد ہے؟ روسی اور امریکی اقوام سے اگر ہمیں جہاد کرنا ہے تو کریں، وہ فی الواقع یاجوج ماجوج ہوں یا نہ، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ یاجوج ماجوج والے اہل کفر کے خلاف مزاحمت کرنے کی کوئی خاص فضیلت کہیں بتائی گئی ہے اور نہ ہی غیر یاجوج ماجوج کے خلاف مزاحمت کو ''کم سعادتی'' کی بات کہیں کہا گیا ہے، پس ان اقوام کو یاجوج ماجوج ثابت کرتے ہوئے ان کے خلاف مزاحمت کی بطورِ خاص ترغیب دینا کم از کم میری تو سمجھ سے بالاتر ہے۔ آپ خود ہی کہتے ہیں کہ ''۱۴۰۰ سال پہلے جو انقلاب آیا، اس وقت بھی استحصالی قوتیں مشرک، نصاریٰ، یہودی اور یاجوج ماجوج تھے اور آج بھی یہی لوگ استحصالی نظام کے خاتمہ کے خلاف ہیں۔'' سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا صحابہ نے اس وقت کی استحصالی قوتوں کے لئے یاجوج ماجوج کا لفظ استعمال کیا تھا اور ان کے خلاف مزاحمت میں کوئی خصوصی جوش وخروش

دکھایا تھا؟ اگر نہیں تو آخر ہمیں اس کی کیا شرعی ضرورت آپڑی ہے؟

مولانا گیلانی نے یاجوج ماجوج کا تعین کرنے کے لئے ''سورۃ الانبیاء'' کی آیت ۹۵، ۹۶ کی جو جدید تفسیر کی ہے اور جس کی بناء پر بعض حلقوں میں آج قطعی طور پر یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ یہودیوں کی ''نشاتِ نو'' سے قبل یاجوج ماجوج کا خروج ضروری ہے، میری نظر میں وہ محل نظر ہے اور اگر مولانا گیلانی زندہ ہوتے تو مضمون میں دیے گئے اپنے عندیہ کے مطابق خود ہی اپنی اس تفسیر سے شاید رجوع کر لیتے، اس تفسیر پر یہاں ناقدانہ کلام کرنے سے بات طویل ہوجائے گی، اگر اللہ کو منظور ہوا تو اپنے کسی مستقل مضمون میں اس پر بات کروں گا۔

تنقید میں صاف گوئی میری مجبوری ہے اور میں اس میں لاگ لپیٹ سے کام نہیں لے سکتا۔ میرے سابقہ مکتوب سے شاید آپ کو کچھ رنج ہوا تھا، اس لئے میں نے یاجوج ماجوج والے آپ کے موقف پر از خود کچھ نہیں لکھا، لیکن جب آپ نے خود نے ہی اس کی خواہش ظاہر کی تو حسبنا اللہ اپنا حقیقی تاثر آپ کے سامنے رکھ دینا مناسب محسوس ہوا۔ مجھے آپ کی عافیت اور خیر خواہی مطلوب ہے، امید ہے کہ یہ معروضات انقباضِ طبع کا باعث نہیں ہونگیں۔ مقدمہ کے دوسرے صفحہ پر ریاض کے حمدی بن حمزہ الصریصری ☆ کا آپ نے ذکر کیا ہے جنہوں نے یاجوج ماجوج کے موضوع پر کوئی نئی رائے پیش کی ہے، مجھے ان کی اس رائے کے بارہ میں جاننے کا اشتیاق ہے لیکن نیٹ پر کہیں دستیاب نہیں ہوسکی۔ آپ سے گذارش ہے کہ اگر ان کی اس موضوع پر کوئی کتاب ہے تو ازراہ کرم اس کا نام اور اس کے ناشر کا نام بتادیں۔

☆ یہ کتاب ریاض (سعودی عرب) سے چھپی ہے۔ اس کتاب کا تعارف ایک روزنامہ میں جناب ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب نے کرایا تھا۔ یہ کتاب ہمارے پاس موجود ہے۔ ذاتی خط کی بجائے اس کتاب کا تعارف یہاں اس لئے کیا جارہا ہے کہ بات تمام قارئین تک پہنچے۔

مکتبہ قرآن اکیڈمی جھنگ کی مطبوعات

صہیونیت، قرآن مجید کے آئینے میں

اور یاجوج ماجوج؟ پر

مبلغ اسلام مولانا عبدالرؤف فاروقی صاحب

مدیر ماہنامہ ''مکالمہ بین المذاہب'' لاہور (اپریل 2014ء) کا تبصرہ

میں سوچ رہا ہوں کہ تبصرہ اس کتاب پر لکھوں یا جناب انجینئر مختار فاروقی صاحب پر کہ جن کی تحقیق، جرأت اور ایمان پر مبنی کاوشیں مختلف انداز میں میرے سامنے ہیں اور آج ہی بالخصوص ان کی دوسری کتاب 'یاجوج ماجوج؟' کا تعارف بھی مجھے کرانا ہے۔ صہیونیت، یہودیوں اور اسرائیلیوں کی اس تحریک کا نام ہے جس کا نصب العین عالمی یہودی ریاست کا قیام ہے۔

الصھیونیۃ: یروشلم کے نزدیک ایک پہاڑ کا نام ہے۔ صہیونیت اسی کی طرف منسوب ہے اور وہ ایک ایسی تحریک کا نام ہے جس کا مقصد فلسطین میں مستقل طور پر ایک یہودی برادری اور نوآبادی کا قیام ہے جس میں اصل فلسطینی باشندوں کا استحصال مضمر ہے۔ (قاموس جدید)

صیون یا صھیون: ان پہاڑیوں سے ایک ہے جن پر یروشلم واقع ہے۔ بائبل کے پرانے عہدنامہ میں پہلی مرتبہ اس کا ذکر یبوسیوں کے قلعہ کے طور پر کیا گیا ہے۔ (2 سموئیل 5:6-9) داؤد بادشاہ نے اس پر قبضہ کرلیا اور اس کا نام داؤد شہر رکھا اس وقت یہ قلعہ ہیکل کے جنوب کی طرف جاتی ہوئی طویل چٹان پر واقع تھا لیکن سب علماء (بائبل کے مفسرین) اس محل وقوع پر اتفاق نہیں کرتے۔ یہ جگہ ایک چشمہ کے نزدیک واقع ہے اور دفاعی لحاظ سے بڑی مناسب ہے اس شہر کا رقبہ دوسرے قلعہ بند شہروں کے برابر ہے..... بائبل کے چند ایک حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر داؤد ہی اصل صہیون ہے۔ داؤد بادشاہ عہد کے صندوق کو صیون میں لایا اور اس وقت یہ پہاڑی

متبرک سمجھی جانے لگی۔ بعد میں جب سلیمان بادشاہ عہد کے صندوق کو نزدیک ہی کوہ ماریا پر ہیکل میں لے گیا تو وہ علاقہ بھی صیون کہلانے لگا۔ پھر تمام یروشلم کو صیون کہا جانے لگا۔ اس نام کو اکثر تمثیلی طور پر یہودی کلیسا (معبد) اور تنظیم اور آسمان کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے (قاموس الکتاب (بائبل) ایس۔ایف خیر اللہ ص205)

مسلمانوں کے ہر طبقے میں صہیونیت کا تعارف اس اعتبار سے ضروری ہے کہ یہ اپنے نصب العین کے اعتبار سے ''عالمی اسلامی ریاست'' کو روکنے میں تمام ابلیسی تحریکوں سے زیادہ حساس اور متحرک ہے۔ یروشلم کے جس پہاڑ کی طرف اس تحریک کی نسبت کی گئی ہے وہ محض ایک جغرافیائی نشان نہیں، یہودی اور اسرائیلی تاریخ اس سے وابستہ ہے یہ تاریخ اور اپنے زوال کو عروج میں تبدیل کرنے کی خواہش نے یہود کو مذہبی اور سیاسی اعتبار سے زندہ رکھا ہوا ہے ورنہ جس طرح کی آزمائشیں اس قوم پر گزری ہیں کسی اور قوم پر گزرتیں تو شاید وہ قوم عاد وثمود کی طرح صرف ایک قصہ بن کر رہ جاتی۔ ایک ایسے مسیح کی آمد کا عقیدہ ''جو داؤد کا تخت اقوامِ عالم سے چھین کر یہود کو واپس دلائے گا'' یہودیوں کی زندگی کا راز ہے اور اسی عالمی یہودی ریاست کے لئے وہ دوسری اقوام کی قوت و ریاست کو تہ و بالا کرنے، ان میں اخلاق وجنسی بے راہ روی پیدا کرنے، اپنے اقتصادی پنجے میں دبوچ کر رکھنے اور قتل وغارت گری کا بازار گرم رکھنے تک ہر حیلہ اور ہر حربہ اختیار کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ ہم جبکہ بحیثیت مسلمان رسول اللہ ﷺ کے ارشادِ گرامی '' ثم تکون خلافة علیٰ منهاج النبوة '' کی روشنی میں خلافت اسلامیہ کے منتظر ہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ اس کے راستے کی رکاوٹ بننے اور مسلمانوں کو اس منزل سے دور رکھنے میں مصروف تحریکوں کا مطالعہ کریں۔ زیرِ نظر کتاب اس سلسلے کی کڑی ہے اور اپنے موضوع، اہداف اور ترتیب کے اعتبار سے بے پناہ مفید ہے۔

کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

باب اوّل:	صہیونیت کے خدوخال
باب دوم:	صہیونیت 600 قبل مسیح سے 610 عیسوی تک
باب سوم:	صہیونیت کی قتل انبیاء کی روش اور انکارِ ختم نبوت
باب چہارم:	صہیونیت کا منطقی انجام

یہ سب کچھ قرآن مجید کی روشنی میں ہے اور احادیث رسول ﷺ کے ذریعہ اسے مزید واضح کیا گیا ہے۔ انجینئر صاحب نے بجا طور پر یہ واضح کیا ہے صہیونی تحریک نے اپنے خلاف لکھنے والوں کو عبرت کا نشان بنا دیا اور کتابوں کو منظر عام پر آنے سے پہلے ہی غائب کر دیا لیکن یہودیت کا پردہ چاک کرنے والی کتاب ''قرآن مجید'' پورے جاہ وجلال کے ساتھ یہودیت کی ریشہ دوانیوں پر تازیانے برسا رہی ہے اور یہودی نہ اس کتاب کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں نہ اس الٰہ کا کہ جس کا یہ کلام ہے۔ ادارہ مکالمہ، قرآن اکیڈمی جھنگ کی شائع کردہ اس کتاب کا مطالعہ ہر طبقے کے مسلمانوں پر بالخصوص علماء اور مذہبی قائدین کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔

''یاجوج ماجوج؟''

☆ زیرنظر کتاب اصلاً ماہنامہ ''حکمت بالغہ'' جھنگ کا خصوصی شمارہ ہے جو ستمبر 2012ء میں شائع ہوا اور اپنی افادیت کی بنیاد پر مزید اضافوں کے ساتھ اس کتاب کی صورت میں شائع ہو رہی ہے ''یاجوج ماجوج'' اہم قرآنی موضوع ہے جس کی تعبیر میں مختلف آراء کے باوجود اُصولوں پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے۔ آج جب سائنسی ترقی کے دور میں سیٹلائٹ کے ذریعہ زمین کے ایک ایک انچ سے باخبر ہونے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ اس قوم کا جغرافیہ کیا ہے۔ سد سکندری کہاں ہے اور قوم کی بود و باش کی تفصیلات کیا ہیں؟ کئی سوالات ہیں جو اُٹھتے ہیں اور ان کا جواب انتہائی تدبر، بصیرت اور اعتقادی توازن کے ساتھ دیا جانا چاہئے۔ کتاب میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا مناظر احسن گیلانی، الشیخ حمدی بن حمزہ الصریری الجہنی اور دیگر علماء و مفکرین اسلام کے حوالہ سے جو تفصیل پیش کی گئی ہے اس سے ذہنی خلفشار کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور مطالعہ کرنے والوں کو بہت سے سوالوں کے جواب مل جاتے ہیں۔ موضوع پر جامعیت کا لحاظ رکھتے ہوئے۔ ''یاجوج ماجوج کے تعارف''..... ''اس کی یلغار'' اور ''اس کا علامات قیامت میں سے ہونا کہ ''حتی اذا فتحت یاجوج و ماجوج'' (الآیہ) واضح کیا گیا ہے اور انہیں ''حاصل کلام'' کے عنوان کے چار صفحات میں سمیٹ کر ذہن کو مجتمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قرآنی علوم سے دلچسپی رکھنے والے تمام مسلمانوں کے لئے اس کا مطالعہ یکساں مفید ہے۔

تعلیم تبلیغ تربیت

بعثت مصطفےٰ ﷺ کا مقصد   توحید و آخرت   تلاوتِ آیات   تفہیم کتاب
تعلیم حکمت   تزکیۂ نفس غلبہ دین

اُمتی کی ذمہ داریاں   ختم نبوت کا تقاضا: حضور ﷺ کی آمد کا مقصد پورا کرنے کے لئے
اُمت مصطفےٰ ﷺ مسلسل انبیاء کرام (علیہم السلام) والا کام کرتی رہے۔
اُمت وسط اور خیر امت کی حیثیت سے تمام انسانوں پر شہادت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔
دین کامل اور اقبال کا مردِ مؤمن۔

یہ کام کیسے ہو؟   تقویٰ اور تزکیۂ نفس کے لئے مسلسل تربیت، ذاتی اصلاح، اہل خانہ کی تربیت اور ماحول کی بہتری کی خاطر ایک اچھا مبلغ اور مصلح بننے کے لئے
قرآن وسنت کی روشنی میں

مربی بنئے (جامع دینی تعلیم اور مسلسل روحانی تربیت)

مفت کتابیں بلا معاوضہ فاصلاتی تربیت   ملک اور بیرونِ ملک سے خواتین وحضرات کے لئے

دعوت فاؤنڈیشن پاکستان

مکان نمبر 1، STI کالونی پلاٹ نمبر 7، سیکٹر H-9 اسلام آباد
فون: 051-4444266، موبائل 0323-5131416-0313-8484860
ای میل: anfides@gmail.com

ان شاءاللہ

من الظلمات الی النور

25روزہ قرآن فہمی کورس کل وقتی

پھر سوئے حرم لے چل

مئی2014ء، جون2014ء، جولائی2014ء، اگست2014ء

3 مئی تا 27 مئی2014ء

جس میں ترجیحاً انٹرمیڈیٹ تعلیم کے حامل طلباء، کاروباری و ملازمت پیشہ اور بے روزگار حضرات شریک ہوسکتے ہیں تاکہ قرآن مجید کے ساتھ ساتھ دیگر دینی علوم سیکھ کر عملی زندگی میں باعمل مسلمان کی زندگی بسر کرسکیں۔

☆ قیام وطعام اکیڈمی کے ذمہ ہوگا۔ ☆ تعلیمی ٹائم ٹیبل اور قواعد وضوابط کی پابندی ضروری ہوگی۔ ☆ خوب صورت لیکچر ہال، مسجد، لائبریری اور دیگر ضروریات ایک ہی چھت کے نیچے۔ ☆ پرسکون اور پاکیزہ ماحول۔

اپنی فرصت کے مطابق نام رجسٹر کرائیں

قرآن اکیڈمی لالہ زار کالونی نمبر2، ٹوبہ روڈ جھنگ صدر

فون: 047-630861-63----0336-6778561

ای میل: hikmatbaalgha@yahoo.com